مونوگراف

# بیگم سلطان جہاں

سیما صغیر

مونوگراف

# بیگم سلطان جہاں

سیما صغیر

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی-110025

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

پہلی اشاعت : 2016
تعداد : 550
قیمت : -/83 روپے
سلسلۂ مطبوعات : 1874

**Begum Sultan Jahan**

By: Seema Sagheer

ISBN :978-93-5160-107-4

---

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،
جسولہ، نئی دہلی 110025، فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099
شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066 فون نمبر: 26109746
فیکس: 26108159 ای-میل: ncpulsaleunit@gmail.com
ای-میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in
طابع: سلا سار امیجنگ سسٹمس، C-7/5، لارنس روڈ انڈسٹریل ایریا، نئی دہلی-110035
اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

# پیش لفظ

ہمارا دور بھی عجیب ہے ایک طرف جہاں اردو زبان کا حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے تو دوسری جانب دوریاں نزدیکیوں میں تبدیل ہوتی جا رہی ہیں۔ جدید تکنیکی انقلاب نے معلومات کے سمندر کو کوزے میں سمیٹ کر ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے ایسے میں اس خوف کا دامنگیر ہونا خلاف واقعہ نہیں کہ ہمارا قدیم و کلاسیکی ادب اس تکنیکی طلاطم کا شکار نہ ہو جائے۔

اپنے نابغہ ادیبوں و شاعروں پر مونوگراف لکھوانے کے اس نئے سلسلے کا آغاز اسی لیے کیا گیا ہے تا کہ ہم نئی نسل کے سامنے کم سے کم صفحات میں معروف ادبا کا سوانحی خاکہ بھی پیش کر سکیں اور ان کی تحریروں کے منتخب نمونے بھی۔

قومی کونسل نے اس سلسلے میں موجودہ اہم اردو قلمکاروں کی خدمات حاصل کی ہیں اور اب وہ وقت آ گیا ہے کہ ہم قارئین کو براہ راست اپنے اس تجربے میں شامل کریں۔ ہماری یہ کوشش ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ اہم ادیبوں پر مونوگراف شائع کر دیں اور یہ بھی کوشش ہے کہ یہ مونوگراف معلومات کا ذخیرہ بھی ہو، اب اس معیار کو ہم کس حد تک حاصل کر سکے اس کا فیصلہ آپ کریں گے لیکن آپ سے یہ گزارش ضرور ہے کہ اپنے قیمتی مشوروں سے ہمیں ضرور نوازیں تا کہ ہم آئندہ ان مشوروں کو نشانِ منزل بنا سکیں۔

**پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)**

ڈائرکٹر

# فہرست


| | |
|---|---|
| ابتدائیہ | vii |
| شخصیت و سوانح | 01 |
| خدماتِ علمی اور نظم و نسقِ ملکی | 11 |
| خواتین کی تعلیم و تربیت | 17 |
| تصنیف و تالیف | 43 |
| علی گڑھ سے خصوصی لگاؤ | 71 |
| ہندو مسلم اتحاد کی سعیِ جمیل | 81 |
| اختتامیہ | 87 |
| بیگم سلطان جہاں ماہ و سال کے آئینے میں | 89 |
| جامع انتخاب | 107 |
| کتابیات | 141 |

# ابتدائیہ

بیگم سلطان جہاں بے حد حساس خاتون تھیں۔انھوں نے اپنی قوتِ ارادی،تعمیری سوچ،شعر فہمی اور علم دوستی کی بدولت ریاستِ بھوپال تاریخ کے اوراق میں زندہ اور تابندہ کر دیا۔ان کا دورِ حکومت (1902-1926) بہتر نظم و نسق کے اعتبار سے بھی سنہرے حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے۔انھوں نے ایک نازک دور سے گزر رہی ریاست بھوپال کو اپنوں اور غیروں کی سازشوں سے محفوظ کرنے کے جتن کیے۔''مجلس وضع قوانین'' اور ''مجلسِ شوریٰ'' کو بے حد فعال بناتے ہوئے قوانینِ زراعت و عدالت کو چُست درست کیا۔پولیس اور فوج کی از سرِ نو تنظیم کروائی۔سماجی،ذہنی اور تہذیبی تربیت کے لیے جدید طرز کے اسپتال بنوائے،ریل کے نظام کا معقول بندوبست کیا،کارخانے لگوائے اور اشاعتی اداروں کو وسعت دی۔

آہنی عزم کی مالک اِس پُر وقار خاتون کی قومی ہمدردی،فیاضی اور دریا دلی کے اَن گنت قصے ہیں۔انھوں نے عوام کو تصورات و تخیلات کی وادیوں سے نکال کر حقیقت کی سنگلاخی سے روشناس کرایا۔علم کی اہمیت اور افادیت کا احساس دلایا اور طبقۂ نسواں میں اس کے پھیلاؤ کو اپنا نصب العین بنایا۔قدیم و جدید کے امتزاج سے درس گاہوں کے لیے ایسا متوازن نصاب تیار کروایا جو مشرقی علوم کی خوبیوں کے ساتھ مغربی فنون کی ضروریات پر مشتمل تھا۔

محسنِ نسواں،بیگم سلطان جہاں کی انتھک کوششوں کی بدولت عورت زندگی کے ہر میدان میں

آگے آکر نئی دنیا کی تعمیر میں اپنا کردار ادا کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ تاہم اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آج کتنے ہی شعبہ ہائے حیات ایسے ہیں جن میں عورت کو اپنی فطری صلاحیتوں کے اظہار کے مناسب مواقع میسّر نہیں ہیں، بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ سیاسی کشمکش کے سبب عہدِ حاضر میں عورتوں کی صلاحیتوں کی نشو ونما، سنجیدہ اور منصوبہ بند کوشش سے بڑی حد تک محروم ہے اور جب صلاحیتوں کے بیدار ہونے اور پروان چڑھنے کے مواقع میں ہی نیک نیتی نہ ہو تو اُن کے باقاعدہ فروغ پر سوالیہ نشان اُبھرنا لازمی ہے۔

آج کی نسل شاید اس سے واقف نہیں کہ جن عظیم اداروں کی خوب صورت اور شاندار عمارتوں کے سائے تلے وہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور اپنے مستقبل کی تعمیر میں مصروف ہیں، ان عمارتوں کے اینٹ گارے میں نواب سلطان جہاں بیگم کا خونِ جگر بھی شامل ہے۔ اُن کے مدبرانہ فکر و عمل کا احاطہ کرنے کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔

میں گرامی قدر پروفیسر سید علی کریم (ارتضٰی کریم)، ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی تہہ دل سے شکر گزار ہوں کہ انھوں نے مجھے بیگم سلطان جہاں پر مونوگراف تحریر کرنے کا موقع فراہم کیا۔ قومی کونسل کے اربابِ اقتدار کا بھی شکریہ ادا کرتی ہوں اور محترمہ ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی کی ممنون ہوں۔

سیما صغیر

# شخصیت وسوانح

مدھیہ پردیش کی راجدھانی ''بھوپال' 1948 سے قبل ''ریاستِ بھوپال'' کے نام سے جانی جاتی تھی۔ اس کی علمی، ادبی، تہذیبی روایت و میراث کی تاریخ سنہرے حروف میں درج ہے۔ ماضی کے دریچوں سے اُبھرتے ہوئے مناظر یہ عکس پیش کرتے ہیں کہ وندھیا چل کی خوب صورت وادیوں میں واقع بھوپال کو عروسِ مالوہ کے لقب سے یاد کیا گیا ہے۔ سنگلاخ چٹانوں سے بنے ہوئے وندھیا چل کے پہاڑ ہمالیہ کی طرح بلند تو نہیں لیکن اپنے اندر بے پناہ کشش رکھتے ہیں۔ اسی کشش نے صوفی سنتوں، ادیبوں اور فن کاروں کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔ تہذیب وتمدن کا یہ مرکز ماضی قریب وبعید میں امن وامان، محبت وسکون اور خوشحالی کا گہوارہ رہا ہے۔ بڑے بڑے نامور علما وفضلا کے زیر سایہ شعرا وادبا بھی یہاں سے اٹھے ہیں جن کے نام تاریخ میں جگمگا رہے ہیں۔ اس خطۂ ارض کے علمی اور ادبی ماحول کو پروان چڑھانے میں حکمرانوں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔

وندھیا چل کے پُرکشش پہاڑوں کے زیرِ سایہ پروان چڑھنے والی تہذیب کے تعلق سے کئی کہانیاں منسوب ہیں۔ ان میں جو مستند کہی جاتی ہے اس کے مطابق شہرِ بھوپال کو اُس راجہ بھوج نے بسایا جس کی راجدھانی دھارنگر تھی اور دورِ حکومت 1018 سے 1060 پر مشتمل تھا۔ آج جہاں بڑا تالاب ہے، ماضیٔ بعید میں وہاں دو پہاڑیوں کے درمیان کم فاصلے کو دیکھ کر اس نے حد بندی کراتے ہوئے اسے رونق بخشی۔ نوتعمیر علاقہ راجا کے نام کی مناسبت سے شہر ''بھوجپال'' کہلایا جو

کثرتِ استعمال سے بھوپال مشہور ہوا۔ بھوجپال میں جہاں بہت بڑا پشتہ بنوایا گیا تھا وہاں ایک مضبوط قلعہ بھی تعمیر کیا گیا۔ اب اس کے اہم نشانات تو باقی نہیں مگر اس علاقے کو آج بھی پرانے قلعے کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

وقت گزرتا رہا۔ نئے نئے شہر آباد ہوتے رہے۔ ان کی رونقوں میں اضافہ ہوتا رہا۔ اِسے وقت کی ستم ظریفی ہی کہیے کہ بھوجپال اپنے آپ میں سمٹتا گیا البتہ اٹھارھویں صدی عیسوی میں راجا بھوج کے بسائے ہوئے شہر میں اچانک ہلچل پیدا ہوتی ہے اور وندھیا چل کی مُرجھائی ہوئی پہاڑیاں پھر سے سرسبز و شاداب ہو اُٹھتی ہیں۔ یہ زبردست کارنامہ صوبۂ سرحد (افغانستان، تیراہ) سے آنے والا اولوالعزم سردار دوست محمد خاں نے انجام دیا۔ تاریخ گواہ ہے کہ 1707 کے بعد محض مغل حکومت ہی نہیں بلکہ پورا ملک افراتفری میں مبتلا تھا۔ بڑھتی ہوئی بدنظمی کے پیشِ نظر دوست محمد خاں کے سپرد 'بھوجپال' کی حفاظت کی ذمہ داری سونپی گئی۔ انھوں نے نہایت سوجھ بوجھ سے کام لیتے ہوئے بہادری اور نظم و نسق کا ثبوت دیا۔ گنور کی رانی کملاپتی کی جانب سے عطا کی گئی جاگیر کو وسعت دے کر حکومت کی جانب قدم بڑھایا۔ 1718 (1130ھ) میں مغل شہنشاہ فرخ سیر نے سردار دلیر جنگ کا خطاب اور فرمان شاہی سے سرفراز کیا۔ اس توثیق کے بعد ریاست کا قیام عمل میں آیا۔ تین سال چار ماہ بعد 1722 میں اپنی سلطنت کا دار الامارات شہر بھوپال کا سنگِ بنیاد رکھا[2] اور باقاعدہ سلطنت کا اعلان کیا۔ 1727 میں اپنی بیگم فتح بی بی کے نام سے قلعہ فتح گڑھ کا سنگِ بنیاد رکھا۔ اس کا پہلا پتھر رائے سین کے مشہور عالم قاضی محمد معظم نے اور دوسرا پتھر فتح بی بی نے رکھا۔[3]

226 سالہ دورِ حکومت میں چودہ حکمراں ہوئے جس میں سلطان محمد خاں نے چند ماہ اور غوث محمد خاں نے برائے نام حکومت کی البتہ خواتین نے نہایت تزک و احتشام کے ساتھ ایک سو سات سال (1819-1926) بھوپال میں حکومت کی۔

1۔ دوست محمد خاں 1722-1740

2۔ سلطان محمد خاں 1740-1741 (تخت نشینی 12 برس کی عمر میں ہوئی)

| | | |
|---|---|---|
| 3۔ یار محمد خاں | 1741-1754 | |
| 4۔ فیض محمد خاں | 1754-1777 | 12/دسمبر (تخت نشینی کے وقت 11/سال کی عمر تھی) |
| 5۔ حیات محمد خاں | 1778-1806 | 3/جنوری |
| 6۔ غوث محمد خاں | 1806-1806 | برائے نام |
| 7۔ وزیر محمد خاں | 1806-1816 | فروری |
| 8۔ نظر محمد خاں | 1816-1819 | 11/نومبر |
| 9۔ گوہر بیگم (قدسیہ بیگم) | 1819-1837 | |
| 10۔ جہانگیر محمد خاں | 1837-1844 | |
| 11۔ سکندر جہاں بیگم | 1844-1868 | 30/اکتوبر |
| 12۔ شاہجہاں بیگم | 1868-1901 | |
| 13۔ سلطان جہاں بیگم | 1901-1926 | |
| 14۔ حمیداللہ خاں | 1926-1948 | |

جرأت واستقلال کے مالک دوست محمد خاں نے اپنے 18 سالہ دورِ حکومت میں ریاست بھوپال کی بنیادوں کو بے پناہ مضبوط کیا۔[4] چھوٹا بیٹا سلطان محمد خاں بارہ برس کی عمر میں مسند نشین کرایا جاتا ہے مگر چند ماہ بعد ہی بڑا بیٹا یار محمد خاں یہ ذمہ داری سنبھال لیتا ہے اور بھوپال کا پہلا نواب قرار پاتا ہے۔ تیرہ سال حکومت کر کے وہ 32 برس کی عمر میں دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔ نواب فیض محمد خاں، نواب حیات محمد خاں، نواب غوث محمد خاں، نواب وزیر محمد خاں اور نواب نظر محمد خاں سے ہوتی ہوئی یہ حکومت 1819 میں گوہر بیگم کے حصہ میں آتی ہے جو قدسیہ بیگم کے نام سے مشہور ہوئیں۔[5] ہنگامی حالات کی بدولت قدسیہ بیگم سے وہ اختیارات اُن کے شوہر نواب جہانگیر محمد خاں کو منتقل کر دیے جاتے ہیں۔

نواب جہانگیر محمد خاں نہایت دور اندیش اور مضبوط قوتِ ارادی کے مالک تھے۔ اُن میں کچھ کرنے کی لگن تھی لیکن حاسدوں اور چاپلوسوں کی بدولت اپنے منصوبوں میں کامیاب نہ ہو سکے۔

محض 27 سال کی عمر میں 9 دسمبر 1844 کو دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے۔ انھوں نے 7 سال دو ماہ اور 28 دن حکومت کی۔ رسم چہلم کے بعد 21 جنوری 1845 کو ان کی بیٹی شاہجہاں بیگم جن کی عمر اس وقت چھ سال کی تھی، کو رئیس تسلیم کیا گیا اور سکندر جہاں بیگم کو اپنی کم سن بیٹی کی سر پرست کی حیثیت سے زمامِ حکومت سونپی گئی۔ نواب سکندر بیگم نے نازک دور سے گزر رہی حکومت کو اپنوں اور غیروں کی سازشوں سے محفوظ کرنے کے جتن کیے۔ انگریزوں کو صورتِ حال سے باخبر کرتے ہوئے انھیں اپنا ہموا بنایا۔ نتیجتاً 28 جنوری 1847 کو انھیں ریاست کا باقاعدہ مختار بنا دیا گیا۔ انھوں نے حکمت عملی اور حسن سلوک سے نہ صرف ریاست کو مضبوط بنانے کا عزم کیا بلکہ شاہجہاں بیگم کی تعلیم و تربیت پر بھی خصوصی توجہ دی اور نہایت دوراندیشی کے ساتھ بخشی باقی محمد کے ہمراہ ان کا رشتہ منسلک کر دیا۔ 26 جولائی 1855 کو عقد ہوا۔ خطبۂ نکاح مولوی عبدالقیوم نے پڑھایا۔ حکومت برطانیہ کی جانب سے ''امراؤالدولہ'' کا خطاب ملا۔

سید مہدی علی سہسوانی 'تاریخ الکہ بھوپال' میں لکھتے ہیں کہ شادی کے گیارہ سال بعد (1866 میں) نواب باقی محمد خاں سفر حج پر روانہ ہوئے تو بالکل صحت مند تھے تاہم واپسی ان کے لیے دشوار ثابت ہوئی۔ مستقل بیمار رہنے لگے اور آخرکار 24 جون 1867 کو اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ اس وقت شاہ جہاں بیگم کی عمر 29 سال تھی۔ نواب باقی محمد خاں سے دو اولادیں ہوئیں۔ سلطان جہاں بیگم اور سلیمان جہاں بیگم۔ والد کی زندگی میں ہی سلیمان جہاں بیگم کا 1858 میں انتقال ہو گیا جن کی یاد میں ''مدرسۂ سلیمانیہ'' قائم کیا گیا۔

شوہر کے انتقال کے ایک سال بعد والدہ، سکندر بیگم کی بھی وفات (30 اکتوبر 1868) ہو گئی۔ شاہجہاں بیگم 16 نومبر 1868 کو نواب ہوئیں اور ان کی بیٹی سلطان جہاں بیگم ولی عہد قرار دی گئیں۔ افراتفری اور تنہائی کے عالم میں انھوں نے مشیروں کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے مولوی صدیق حسن خاں سے 8 مئی 1871 کو عقد کر لیا۔ حکومت برطانیہ نے ان کو ''والا جاہ، امیر الملک'' کا خطاب دیا۔ صدیق حسن خاں دوراندیش، مدبر اور عالم تھے۔ ریاست بھوپال کے لیے بے حد مددگار ثابت ہوئے۔ 20 فروری 1890 کو ان کا انتقال ہوا۔

تیس سالہ دورِ حکومت میں، شاہجہاں بیگم نے ریاست میں جدید طرز کے اسپتال بنوائے۔

ریل کے نظام کا بندوبست کیا۔ کارخانے لگوائے۔ ڈاکٹر سلیم حامد رضوی کی تحقیق کے مطابق عہد شاہجہانی میں چودہ تذکرے لکھے گئے۔ وہ خود شاعرہ تھیں اور تخلص شیریں تھا۔ ان کے دو دیوان ''تاج الکلام'' اور ''دیوانِ شیریں'' دستیاب ہیں۔ مدرسۂ سلیمانیہ کو وسعت دیتے ہوئے 1892 میں اس کا الحاق کلکتہ یونیورسٹی سے کیا۔ ''مطبع شاہ جہانی'' قائم کیا اور 1871 میں اردو کا پہلا ہفت روزہ اخبار ''عمدۃ الاخبار'' کے نام سے جاری کیا۔ تاج المساجد بنوائی اور برطانیہ میں بھی ایک بڑی مسجد تعمیر کروائی۔

سلطان جہاں بیگم کی ولادت 9 جولائی 1858 میں ریاستِ بھوپال کے عالیشان قصر موتی محل میں ہوئی۔ ان کی نانی نواب سکندر بیگم نے فرمایا کہ ''یہ بچی مجھے سات بیٹوں سے زیادہ عزیز ہے''۔ نانی نے ہی ان کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا۔ حیات سکندری کے صفحہ نمبر 174 پر درج ہے کہ نواب سکندر بیگم نے اپنی نواسی سلطان جہاں بیگم کی چار سال کی عمر تک بڑے ناز و نعم سے تربیت کی۔ کھیل کود کے ساتھ آداب مجلس و معاشرت سے ان کی عمر کے مطابق روشناس کرایا۔ ساڑھے چار سال کی عمر پوری ہونے پر سکندر بیگم نے بڑی شان و شوکت کے ساتھ 3 نومبر 1882 کو ان کی تقریب بسم اللہ منعقد کراتے ہوئے باضابطہ تعلیم کا اعلان کیا۔

سلطان جہاں اس اعتبار سے بھی خوش قسمت تھیں کہ نانی، والدہ اور والد، موصوفہ کی تعلیم و تربیت کا خاص خیال رکھتے تھے۔ محمد امین زبیری مارہروی نے ''بیگمات بھوپال کے حصہ دوم'' میں اس کا تفصیلی ذکر کیا ہے کہ نواب باقی محمد خاں اپنی بیٹی کو نہ صرف بے حد عزیز رکھتے تھے بلکہ ان کی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کا بھی خاص خیال رکھتے تھے۔ ان کے انتقال کے وقت سلطان جہاں کی عمر دس سال کی تھی تاہم سلطان جہاں کے ذہن پر بیٹھے ہوئے نقش اتنے گہرے تھے کہ وہ کبھی ذہن سے محو نہیں ہو سکے اور شاید اسی وجہ سے وہ مولوی صدیق حسن خاں کو والد کی حیثیت سے پوری طرح قبول نہیں کر سکیں۔

17 اکتوبر 1873 کو احمد علی خاں کے ساتھ ان کی منگنی کی رسم ادائی اور یکم فروری 1875 کو شوکت محل میں عقد ہوا۔ قاضی زین العابدین نے خطبۂ نکاح پڑھا، اور دو کروڑ روپیہ مہر مقرر ہوا۔ دو دن بعد باغ نشاط افزا میں چوتھی کی رسم ادا ہوئی۔ اس موقع پر نواب شاہجہاں بیگم نے اپنے داماد کو

''نظیر الدولہ سلطان دولہا'' کا خطاب اور چالیس ہزاری جاگیر عطا کی اور اپنے محل سے متصل حمید منزل ان کے لیے مختص کر دی جہاں وہ صدر منزل کی تعمیر تک اپنی بیگم کے ساتھ قیام پذیر رہے۔ احمد علی نے اپنے ذاتی خرچ سے اہل و عیال کے لیے صدر منزل تعمیر کروائی۔ سلطان جہاں بیگم کی ازدواجی زندگی صدر منزل میں بہت پُر مسرت اور کامیاب رہی۔ یہاں ان کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں پیدا ہوئیں۔

1۔ 25 اکتوبر 1875 کو صاحبزادی بلقیس جہاں بیگم پیدا ہوئیں جن کا بارہ سال چھ ماہ کی عمر میں 1888 میں انتقال ہو گیا۔

2۔ صاحبزادہ محمد نصر اللہ خاں 4 دسمبر 1876 کو پیدا ہوئے۔ ذیابطیس کی بیماری میں مبتلا ہو کر 3 ستمبر 1924 کو اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئے۔

3۔ صاحبزادہ حافظ کرنل محمد عبید اللہ خاں 3 نومبر 1878 کو پیدا ہوئے دل کی بیماری میں مبتلا رہ کر 24 مارچ 1924 کو انتقال ہوا۔

4۔ صاحبزادی آصف جہاں بیگم 3 اگست 1880 کو پیدا ہوئیں۔ 14 سال 4 ماہ زندہ رہ کر 22 جولائی 1894 کو دنیا سے رخصت ہو گئیں۔

5۔ نواب محمد حمید اللہ خاں 9 ستمبر 1894 کو پیدا ہوئے اور 4 فروری 1960 میں انتقال ہوا۔

16 جون 1901 کو سلطان جہاں بیگم کو حکومت برطانیہ کی جانب سے نواب تسلیم کیا گیا۔ والدہ کے دو ہفتہ کے سوگ کے بعد 4 جولائی 1901 میں گورنر جنرل کے نمائندے میجر ہیٹر کی موجودگی میں رسم تاجپوشی ادا کی گئی اور ان کے شوہر کو احتشام الملک عالی جاہ کا خطاب ملا۔ یکم جنوری 1902 میں شوہر احمد علی خاں کا انتقال ہو گیا۔

نواب سلطان جہاں بیگم کے ان گنت قابلِ قدر کارنامے ہیں۔ آپ نے قدیم و جدید کے امتزاج سے ایک ایسا متوازن نصاب جاری کیا جو مشرقی علوم کی خوبیوں کے ساتھ نئے مغربی فنون کی ضروریات پر مشتمل تھا۔ انھوں نے خاص طور پر طبقۂ نسواں میں تعلیم کے پھیلاؤ کو اپنا نصب العین بنایا۔ 5 دسمبر 1911 کو علی گڑھ میں تعلیمِ نسواں کے موضوع پر منعقد ہونے والے جلسے کی صدارت فرمائی جس میں سروجنی نائیڈو اور پنڈت سرلا دیوی بھی شریک ہوئیں۔ اسی سرزمین

پر 1914 میں لڑکیوں کے اسکول کا افتتاح کیا اور ان کے لیے بورڈنگ ہاؤس کا سنگِ بنیاد رکھا۔ (اس شاندار تقریب میں ملک کے مختلف صوبوں سے مدعو خواتین نے شرکت کی اور بہت دنوں تک ایک جشن کا ماحول بنا رہا۔ نواب سلطان جہاں کو اس موقع پر سپاس نامہ پیش کیا گیا جس کے جواب میں سرکار عالیہ نے ایک پُر مغز تقریر کی۔ اخبارات و رسائل میں اس تقریب اور ان کی تقریر کا نہ صرف بہت دنوں تک چرچا رہا بلکہ دور رس نتائج بھی برآمد ہوئے۔ رفتہ رفتہ مسلم شرفا کے خاندانوں نے اپنی بچیوں کو یہاں تعلیم کے لیے داخل کرانا شروع کیا۔ تقریب کی مکمل روداد رسالہ ''خاتون'' ماہ فروری مارچ 1914 میں درج ہے)۔

سلطان جہاں بیگم نے پہلے سے قائم اشاعتی ادارے کو وسیع کیا۔ تعلیمِ نسواں کے لیے رسالوں کو فروغ دیا۔ انھوں نے اپنے حاکمانہ اثر کو فروغ تعلیم کے سلسلے میں استعمال کیا اور اہلِ بھوپال کے جملہ طبقات کو تعلیم کی جانب مائل کرتے ہوئے ان میں خودداری کا جذبہ بھی پیدا کیا۔ عورتوں کے لیے بڑے پیانے پر تعلیم وتربیت کا انتظام کرتے ہوئے لیڈیز کلب قائم کیا (پرنس آف ویلز کلب کا 1904 میں سنگ بنیاد رکھا گیا، یہ 1905 میں تیار ہوا، باقاعدہ افتتاح 1908 میں لیڈی منٹو کے ہاتھوں ہوا)۔

نواب سلطان جہاں بیگم نے اردو، فارسی، عربی اور انگریزی میں دسترس حاصل کی۔ شہہ سواری اور نشانہ بازی سیکھی، حسنِ تدبیر اور پھر اپنی تصانیف وتقاریر کے ذریعے اہلِ ہند خصوصاً خواتین کی زندگی تبدیل کرنے کی امکانی جدوجہد کی۔ خواتین کو قدامت پسندی اور جہالت پر شرم دلائی۔ بیگم صاحبہ کو اردو زبان کے فروغ سے بھی حد درجہ دلچسپی تھی حالانکہ نواب سکندر جہاں بیگم کے زمانے سے اردو سرکاری زبان بن چکی تھی مگر سلطان جہاں بیگم نے ملک کے نامور ادیبوں کی حوصلہ افزائی اور سرپرستی اس طرح کی کہ وہ دور دور سے بھوپال کی طرف رجوع کرنے لگے۔ انجمن ترقی اردو اور مولوی عبدالحق کی مدد کی۔ سیرت النبی کی اشاعت کا بندوبست کیا۔ وہ خود با کمال مصنفہ تھیں انھوں نے چالیس سے زیادہ کتابیں تصنیف کیں جو بھی اردو زبان میں ہیں اور جب تک حیات رہیں تصنیف وتالیف کا سلسلہ جاری رکھا۔ دوسرے مصنفین اور مؤلفین کی بھی ہر ممکن مدد کی۔ بیگم صاحبہ کی جد و جہد سے عوام وخواص میں اردو تہذیب وتمدن سے دلچسپی پیدا ہوئی، رہن سہن، خیالات اور

تصورات میں بھی تبدیلی آئی۔ نتیجتاً جدید ادب کی اشاعت کو فروغ ملا۔ وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی پہلی چانسلر ہی نہیں بلکہ واحد خاتون ہیں جو دوبار چانسلر مقرر ہوئیں۔ زبان و ادب اور ملک و ملت کی اصلاح میں سرگرم رہنے والی اس حکمراں نے 1910 میں پرنس آف ویلز کے جلسے میں رسم و رواج اور تکلفات کے خلاف تقریر کرتے ہوئے کہا تھا:

''مجھے ایک عرصہ سے اس امر پر یقین ہے کہ اگر مسلمانوں کی تقریبات کی رسومات میں اصلاح ہو جائے تو ایک بڑی حد تک افلاس کی مصیبت دور ہو جائے گی اور ان کو گناہوں اور بداخلاقیوں سے جو ان رسومات کا لازمی نتیجہ ہیں، نجات ملے گی۔'' (بیگمات بھوپال)

محسنِ نسواں نواب سلطان جہاں بیگم نے خواتین کو ترقی کے مواقع فراہم کرنے اور اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے مارچ 1914 میں ہندستانی خواتین کی مصنوعات کی نمائش کا اہتمام کیا۔ یہ طبقۂ نسواں کی تفریح کے ساتھ ساتھ سماجی، ذہنی، تعلیمی اور تہذیبی تربیت کے لیے بھی فالِ نیک تھا۔ بھوپال میں جو سوسائٹی اور پرنس آف ویلز لیڈیز کلب قائم کیا اس کلب میں سب سے پہلا قومی جلسہ تعلیم نسواں خصوصاً علی گڑھ سے متعلق تھا۔ بیگم صاحبہ بھوپال اپنے سینے میں ایک دردمند دل رکھتی تھیں۔ ان کی قومی ہمدردی، فیاضی اور دریا دلی کے ثبوت وہ عطیات ہیں جو انھوں نے وقتاً فوقتاً مختلف تعلیمی اداروں اور انجمنوں کو دیے۔

سرسید احمد خاں کی بھوپال آمد کے بعد علی گڑھ پر بھی ابرِ سلطانی کھل کر برسا۔ وہ اس ادارے کو کثیر عطیاتِ سلطانی سے نوازتی رہیں۔ کانفرنس اور کالج کے نظامِ عمل کو بہتر بنانے کے لیے آپ کو مدعو کیا گیا۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی نے نہایت عقیدت اور احترام کے ساتھ محترمہ سے سائنس کالج کا سنگِ بنیاد رکھنے اور سالانہ کانوکیشن میں طلبا کو نصیحت کرنے کی درخواست کی۔ اس موقع پر سرکار عالیہ نے فرمایا ''بلاشبہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو محض اپنی خوب صورت، دیدہ زیب عمارت سے نہیں بلکہ اپنے شاندار نتائج سے دنیا کی یونیورسٹیوں میں ایک منفرد مقام حاصل ہے۔''

والیِ ریاستِ بھوپال وہ تاجدار خاتون ہیں جن کے کارناموں پر مرد سلاطین وامرا بھی رشک کر سکتے ہیں۔ ربع صدی پر مشتمل ان کا دورِ حکومت بھوپال کا زرین عہد تھا۔ وہ مشرقی و مغربی تعلیم و تمدن کا ایسا سنگم تھیں جو آج مصلحین امت کا آئیڈیل ہے۔ بیگم صاحبہ زندگی کے آخری دنوں تک ملک و قوم کی خدمات انجام دیتی رہیں اور خواتین کو تعلیمی جہت نیز ان کے حقوق سے آشنا کراتی رہیں۔ 9 جون 1926 کو امورِ سلطنت اپنے فرزند نواب حمید اللہ خاں کے سپرد کیے اور 12 مئی 1930 کو اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملیں۔ قاضی محمد تحسین اناوی اِس المناک حادثہ پر اشک بار ہوتے ہوئے قطعۂ تاریخ وفات یوں تحریر فرماتے ہیں۔

دانش میں فرد، علم میں یکتا ہُنر میں ایک
اوصاف مجتمع یہ سبھی جانشیں میں ہیں
سالِ وفات کے لیے ہاتف نے دی ندا
سلطانۂ جہاں بہشت بریں میں ہیں

یہ نہ صرف ایک فرمانروا ریاست کی موت تھی بلکہ ایک اعلیٰ درجہ کی خطیب، مصنف، مصلح قوم اور طبقۂ اناث کی محسن اور رہبر کی موت تھی۔ تاریخ ہند کے اوراق کو پلٹ کر دیکھیں تو مسلم خواتین میں نواب سلطان جہاں جیسی نامور مایۂ ناز اور عدیم المثال خاتون ملنا مشکل ہے۔ بالخصوص نسائی طبقہ میں وہ باعثِ صد افتخار رہیں گی۔

---

1: بھوپال اور والیانِ بھوپال، نواب سلطان جہاں بیگم حیات و خدمات، مرتبہ اطہر صدیقی، ص 171۔

2: تاریخ ریاست بھوپال، ایم عرفان، ص 93۔

3: تاج الاقبال، تاریخ بھوپال از نواب شاہجہاں بیگم، ص 7۔

4 و 5: بھوپال اور والیانِ بھوپال، صغیر افراہیم، نواب سلطان جہاں بیگم۔ حیات و خدمات، ص 171

# خدماتِ علمی اور نظم ونسقِ ملکی

نواب سلطان جہاں بیگم کے لیے حکومت پھولوں کی سیج نہیں تھی۔ خاندانی چپقلش کے ساتھ ساتھ پچھلے بیس بائیس برسوں میں ریاست نے تین بڑے قحطوں کا سامنا کیا تھا۔ اس کا اندازہ میجر میڈ ایجنٹ گورنر جنرل کی تقریر سے لگایا جا سکتا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''گذشتہ سالوں میں قحط اور وبا سے آپ کی ریاست کو سخت صدمہ پہنچا ہے اور حال کی مردم شماری کے مطابق اس ریاست کی آبادی میں سے تقریباً 30 فیصدی چلے گئے ہیں اور زمین مزروعہ تقریباً ایک ثلث غیر آباد ہو گئی ہے اگر درحقیقت یہ اندازہ درست ہے تو اس میں کلام نہیں کہ منجملہ اور مشکلات کے یہ بھی ضروری ہے کہ ریاست کی آمدنی میں بہت کچھ نقصان ہوا ہے۔ یہ آپ کا حصہ ہوگا کہ مدبرانہ تدابیر سے اس آبادی کو پورا کر کے ریاست کے محاصل کو درست کریں۔''[1]

مسند نشینی کی اسی محفل میں نواب سلطان جہاں بیگم نے اپنی تقریر میں فرمایا:

''مالی حالت ریاست کی بوجوہ چند در چند نہایت قابل توجہ ہے اور رعایا میں افلاس و نادہندی سرایت کر گئی ہے۔ اگر چہ اس میں مجھے بہت ہی مشکلات کا سامنا ہوگا کیونکہ افتادہ زمینوں کا ازسرِ نو آباد ہونا خصوصاً ایسی

حالت میں کہ تقریباً ایک ثلث مردم شماری گھٹ گئی ہو بالضرور ایک اہم
کام ہے۔"2

ان اقتباسات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آفات ارضی وسماوی کی بدولت آمدنی بہت گھٹ چکی تھی۔ اس حد تک کہ باگ ڈور سنبھالتے وقت خزانے میں صرف چالیس ہزار روپے موجود تھے جبکہ فوری طور پر ریاست کے ملازمین کو ماہانہ تنخواہ کے طور پر دولاکھ روپے ادا کرنے تھے۔ اس کے لیے بیگم صاحبہ نے اپنے ذاتی اثاثے کا استعمال کیا۔ اراکین کے مشورے کے بعد ٹیکس، لگان اور قرض معاف کیا۔

**مال گزاری کا بندوبست**

موجودہ صورت حال کے پیش نظر انھوں نے ایک لائحہ عمل تیار کروایا۔ کاشتکاروں کو فوری طور پر مطمئن بلکہ آسودہ کرنے کے لیے پنج سالہ بندوبست کے ساتھ پانچ لاکھ پچپن ہزار چار سو بہتر روپے تیرہ آنے کی رعایت دی گئی اور دوران بندوبست میں جمع کے متعلق عذرداریاں بھی سماعت کی گئیں۔ "حیات سلطانی" کے صفحہ نمبر 41 پر درج ہے کہ مذکورہ بندوبست 1908 میں ختم ہوگیا۔ اپریل 1909 سے جولائی 1909 تک تمام دیہات کے پٹے تقسیم کردیے گئے۔

**قوانینِ عدالت**

نواب سلطان جہاں بیگم نے بہتر نظم ونسق کے لیے قوانین میں ترمیم، تکمیل وتنسیخ کی۔ "مجلس وضع قوانین" قائم کی اور اس کی ایک اہم میٹنگ میں انھوں نے فرمایا کہ:

"میں نے منجملہ اور ضروریات کے قوانین کی ترمیم وتکمیل بھی ضروری سمجھی
کیونکہ ملک کا انتظام اور امن وامان کا قیام دادرسی اور تلافی حقوق کا انحصار
مکمل اور عمدہ قوانین ہی پر ہوتا ہے۔" 3

انھوں نے قوانین پر نظر ثانی ہی نہیں کی بلکہ درجنوں نئے قانون بنائے اور انھیں نافذ کرانے کا بھی جتن کیا جس سے عدلیہ کا وقار بلند ہوا۔ محمد امین زبیری مارہروی لکھتے ہیں کہ:

"غالباً سرکار عالیہ ہی وہ پہلی خاتون تھیں جنھوں نے ایک جج اور عدالت

کے مرکزِ اعلیٰ کی صورت میں اپنے آپ کو نمایاں کیا اور پھر اس کے فرائض
کمال لیاقت کے ساتھ انجام دیے اور فیصلے بطور نظائر ریاست کی عدالتوں
کی رہنمائی کے لیے شائع ہوتے رہے۔" 4

چونکہ سلطان جہاں بیگم کی تربیت ان کی نانی، والدہ اور والد نے بڑی دلجمعی کے ساتھ کی تھی۔ اس لیے وہ بہتر سے بہتر حکومت کے لیے کوشاں رہتیں۔ انھوں نے رعایا کو مراعات دینے کے لیے "مجلسِ شوریٰ" کو تقویت پہنچائی، جو جمہوریت کا نقشِ اول کہا جاسکتا ہے۔ وہ فرماتی ہیں:

"میرا مقصد یہ تھا کہ ایک ایسا گروہ مجلسِ شوریٰ کے ممبروں میں ہو جو تعلیم
یافتہ اور حالاتِ ملک سے واقفیت رکھتا ہوتا کہ وہ مجلسِ شوریٰ میں حقوقِ
رعایا کی وکالت کرے اور سرکاری ممبروں کے ساتھ ہر ایک بحث و مباحثہ
میں شریک ہو۔" 5

## پولیس اور فوج کی از سرِ نو تنظیم

وہ اس بات کو بخوبی سمجھ چکی تھیں کہ ریاست کو خوشحال بنانے کے لیے پولیس اور فوج کا بہتر انتظام لازمی ہے اور ان دونوں میں آپسی ربط بھی ہونا چاہیے۔ ریاست کے اندرونی معاملات کو چاق و چوبند بنانے کے لیے محکمۂ پولیس کو بے حد توانا بنایا۔ اس محکمہ کے نظم و ضبط کو دیکھ کر معائنہ پر آئے ممالک متحدہ کے انسپکٹر جنرل پولیس نے ریکارڈ بُک میں لکھا کہ:

"یہاں کی پولیس کی صورت ظاہری دیکھ کر میں خیال کرتا ہوں کہ کسی دیسی
ریاست کی اس سے بہتر پولیس اب تک میرے دیکھنے میں نہیں آئی۔" 6

چُست دُرست پولیس کے ساتھ ساتھ فوج کی اعلیٰ تربیت کا بھی انھوں نے خاص خیال رکھا بلکہ "امپیریل سروس ٹروپس" کو بے حد فعال بنانے کے لیے صاحبزادہ محمد عبید اللہ خاں کو خصوصی تربیت دلوائی۔ ان کی مذکورہ انتظامی صلاحیتوں کو دیکھ کر انگریز افسران بھی دنگ رہ گئے۔ 1908 میں لارڈ کچنر نے ریاست کی فوج کا معائنہ کرتے ہوئے اپنی تقریر میں کہا:

"سرکار عالیہ کی افواج کا معائنہ کرنے سے مجھ کو نہایت درجہ خوشی ہوئی اور اعلیٰ درجے کی رپورٹیں جو قبل اس کے مجھے پہنچی تھیں، میں ان کی ذاتی طور پر تصدیق کرتا ہوں۔ سرکار عالیہ اپنے سپاہیوں کی بہتری وعمدگی میں جو نہایت دلچسپی لیتی ہیں اور جو عمدہ نگرانی اور کمانڈ آپ کے صاحبزادے کرنل محمد عبیداللہ خاں کرتے ہیں اس سے نہایت ہی قابل اطمینان نتیجہ پیدا ہوا جو ہم نے آج صبح کو پریڈ پر دیکھا۔" 7

انھوں نے فوج کی دلچسپی کے لیے ملٹری کلب، کے نام سے ایک بڑی عمارت تعمیر کروائی اور اس میں ثقافتی پروگرام بھی شروع کرائے تاکہ وہ ذہنی دباؤ اور جسمانی تھکن سے نجات حاصل کر سکیں۔

نواب سلطان جہاں بیگم نے جنگی پیمانے پر سڑکوں کی مرمت کروائی بلکہ جدید سڑکیں بھی بنوائیں۔ ڈاک خانے کے انتظام فعال بنانے کے لیے ان کو برطانوی ڈاک خانوں میں ضم کر دیا۔ اسٹیٹ کونسل کا نیا ڈھانچہ تیار کروایا اور بے پناہ تعمیری کام کیے مثلاً

1- مولوی ضیاء الدین کی ٹیکری پر احمد آباد بسایا (شوہر نواب سلطان دولہا کی یاد میں)
2- قصر سلطانی بنوایا اور اس کے اندرون خانہ میں مسجد عبرت تعمیر کروائی۔
3- ضیاء الابصار اور ضیاالاثمار باغ لگوائے۔
4- کوٹھی "نورالصباح" تعمیر کروائی (نواب حمید اللہ خاں کی بڑی بیٹی کے لیے) باغ لگوایا، سوئمنگ پول اور ہاکی گراؤنڈ بنوایا۔
5- کوٹھی "قرن السعدین" بنوائی۔
6- عیدگاہ اور شملہ پہاڑی پر کوٹھیاں تعمیر کروائیں۔
7- ملٹری کلب اور یاٹ کلب تعمیر کروائے۔
8- ریونیو کورٹ، پی۔ ڈبلیو۔ ڈی۔ اور جوڈیشل کورٹ کی عالیشان عمارتیں بنوائیں۔
9- حمیدیہ لائبریری 1912 میں تعمیر کروائی۔
10- ایڈورڈ میوزیم (شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم کے نام پر) 1909 میں قائم کیا۔

11- الگزینڈرا اسکول کو نئی شکل دی۔
12- دارالشفقت یتیم خانہ بنوایا۔
13- حفاظ کے لیے "مدرسہ عبیدیہ" کھلوایا۔
14- سلطانیہ اسکول کو جدید طرز پر قائم کیا۔
15- مسجد سلطان جہاں (لال گھاٹی کے اوپر) بنوائی۔
16- منٹو ہال کی تعمیر کرائی۔

---

1: حیات سلطانی مؤلف محمد امین زبیری مارہروی، ص۔ 37
2: بیگمات بھوپال، حصہ دوم، از محمد امین زبیری مارہروی، ص۔ 7
3: حیات سلطانی، مؤلف محمد امین زبیری مارہروی، ص۔ 46
4: ایضاً، ص۔ 49
5: گوہر اقبال، ص 155۔
6: بیگمات بھوپال، حصہ دوم، ص۔ 10
7: گوہر اقبال (تاریخ بھوپال) حصہ اول، ص۔ 347

# خواتین کی تعلیم وتربیت

**تاریخ** گواہ ہے کہ نواب سلطان جہاں بیگم سے قبل ہندستانی سماج میں عورت کے تعلق سے متعدد مسائل ایسے تھے جو پورے سماج کو گھن کی طرح کھائے جارہے تھے اور معاشرے میں بے شمار تلخیاں پیدا کر رہے تھے۔ اس نبض شناس خاتون نے طبقۂ نسواں کی بے کسی، مجبوری اور لاچاری کو سمجھتے ہوئے سماجی شعور کو جھنجھوڑا، اور معاشرے میں ان کے لیے مساوی حقوق کی طلب گار ہوئیں۔ ان کی یہ شعوری کوشش خواتین کو ذلت اور رسوائی کے غار سے نکالنے کی تھی جس کے لیے انھوں نے ہر ممکن جتن کیا۔ مثلاً شوہر کا انتخاب بھی اس دور میں ایک اہم مسئلہ تھا۔ بیشتر والدین معاشرے سے اس حد تک خوفزدہ تھے کہ وہ لڑکی سے اس بابت مشورہ کرنا تو دور، اس کی پسند ناپسند معلوم کرنے سے بھی گریز کرتے تھے۔ عموماً لڑکے کی مالی حالت، سماجی پوزیشن اور حسب نسب کا تو خیال رکھا جاتا مگر اس کی عادت، خصلت، طور طریق، عمر اور صحت کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی جاتی۔ اس کی ذہنی اپروچ کیا ہے؟ اُسے اپنی ذمہ داریوں کا کس حد تک احساس ہے، اس طرح کی چھان بین کا کوئی خانہ نہیں تھا۔ بیگم سلطان جہاں نے اس جانب بھی توجہ دی۔ ان کو اس بات کا یقین تھا کہ خواتین کی زبوں حالی اور پسماندگی کے لیے معاشرہ ذمہ دار ہے لہٰذا ان کی حالت بہتر بنانے کے لیے سماج کی ذہنیت بدلنے کی ضرورت ہے۔ اس کام میں انھوں نے عملی کوششوں کے ساتھ ساتھ قلم کا سہارا بھی لیا اور اپنے ادب پاروں کے ذریعے عورتوں پر بیجا پابندیوں کے خلاف

سخت احتجاج کیا۔ انھوں نے یاددلایا کہ دنیا کے تمام مذاہب میں عورت کو بلند مقام پر فائز کیا گیا ہے مگر سماج ان کے ساتھ غیر منصفانہ سلوک کر رہا ہے جبکہ سب جانتے ہیں کہ خواتین کو نظر انداز کر کے کوئی معاشرہ ترقی نہیں کر سکتا۔ وہ اپنی ماں اور نانی کی طرح انقلابی ذہن کی مالک تھیں، اس لیے معاشرے میں واضح تبدیلی لانا چاہتی تھیں۔ اس مقصد کے تئیں انھوں نے مصالحانہ نہیں بلکہ جارحانہ رویہ اختیار کیا۔ پسند کی شادی کی اجازت، جہیز، مہر، طلاق، بیوہ اور وراثت کے حقوق کو موضوع بنایا۔ قدامت پرستی کے خلاف نڈر ہوکر صدائے احتجاج بلند کی، سماج کی فرسودہ روایات، ذات پات اور نئی پرانی نسل کے بیچ حائل گتھیوں کو موضوع بنا کر ادب پاروں کی تخلیق کی۔ متوسط طبقے کی خواتین کی نفسیاتی پیچیدگیوں، ان کی گھٹی گھٹی زندگیوں سے وابستہ مسائل اور ذہنی پسماندگی پر خصوصی اہمیت دی۔ 1909 میں اپنی سالگرہ کے جشن کے موقع پر جو دربار منعقد فرمایا تھا اس میں تعلیم نسواں کے تعلق سے ایک شاندار اسپیچ دی۔ اس میں اپنی رعایا کو گورنمنٹ کی وفاداری کی برکتوں سے آگاہ کیا۔ اور ان کو تعلیم کے فوائد بتائے۔ ہر ہائینس نے فرمایا کہ ''میری ریاست کے جاگیرداروں کی حالت تعلیم کے لحاظ سے بہت ہی پست ہے اور صرف عمدہ تعلیم ہی لوگوں کو نیک شہری اور وفادار بنا سکتی ہے۔''

ہر ہائینس کا یہ خیال ان سابقہ خیالات اور کوششوں کا ایک تتمہ ہے جن کا اظہار بارہا ہو چکا ہے۔ اُن کی تعلیمی کوشش قابلِ تعریف اور قابلِ تقلید رہی ہے۔ دوسرے والیان ریاست بھی جواب تک تعلیمی ضروریات اور اس کی ترقی کی طرف مائل نہیں ہوئے تھے وہ بھی ہر ہائینس کے نقشِ قدم پر چلنے کو مجبور ہوئے۔ محترمہ یہی چاہتی تھیں کہ امرا و روٴسا اسی راہ پر چلیں تو جہالت کی گھنگھور گھٹائیں جو آج کل سرزمین ہند پر چھائی ہوئی ہیں بہت جلد صاف ہو جائیں اور لوگ تہذیب اور علم کی روشنی سے بہرہ ور ہونے لگیں۔

بیگم سلطان جہاں نے حُسنِ تدبیر، تصانیف اور تقاریر کے ذریعے خواتین کو فکری اور عملی اعتبار سے بدلنے کی ہر ممکن جدوجہد کی اور ان کو قدامت پسندی اور جہالت پر شرم دلائی۔ 1910 میں پرنس آف ویلز کے جلسے میں رسم و رواج اور تکلفات کے خلاف تقریر کرتے ہوئے انھوں نے خواتین کو خبردار کیا، توہمات سے بچنے کی تلقین کی اور گناہوں و بداخلاقیوں سے گریز کی تاکید کی۔

بیگم سلطان جہاں نہ صرف رسم ورواج، توہمات وعقائد پر گفتگو کرتی ہیں بلکہ پردہ کے تعلق سے بھی انھیں آگاہ کرتی ہیں کہ حجاب اعلیٰ تعلیم یا کسی منصب پر فائز ہونے میں مانع نہیں ہے بلکہ حجاب خواتین کے لیے تحفظ کا سامان فراہم کرتا ہے اوراس کی عظمت وتقدس کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ اسلام میں خواتین کے لیے نہ صرف پردے کا حکم آیا ہے بلکہ اس کے بڑے فضائل بیان کیے گئے ہیں۔ عورت حجاب میں رہ کر دنیا کے تمام کام انجام دے سکتی ہے، تعلیم حاصل کر سکتی ہے، نظامِ حکومت چلاسکتی ہے۔ خاوند کی فرماں برداری کے لیے اگر کہا گیا ہے تو اس کے بھی مختلف اسباب ہیں۔ اس سے مرد کی برتری ثابت نہیں کی گئی ہے بلکہ یہ باور کرانا مقصود ہوگا کہ وہ شوہر کی تابعداری کرتے ہوئے گھر میں سکون واطمینان کا ماحول قائم کرکے معاشرے کی تعمیر میں مددگار ثابت ہوں۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ ان گھرانوں میں عموماً امن وسکون کا ماحول ہوتا ہے جہاں خواتین اپنے خاوند کی تابعدار ہوتی ہیں اور جہاں ایسا نہیں ہوتا وہاں کھینچ تان ہوتی ہے، گھر کا نظام درہم برہم ہوتا ہے لیکن اس کا قطعی مطلب یہ نہیں ہے کہ خواتین کو صرف خاتون خانہ بنادیا جائے یا اسے گھر کی چہار دیواری میں قید کردیا جائے بلکہ شریعت کے دائرے میں رہتے ہوئے انھیں زندگی کے مختلف میدانوں میں آگے بڑھنے کے تمام مواقع فراہم کیے جائیں۔

بیگم سلطان جہاں نے اپنی تحریر وتقریر کے ذریعے اس جانب توجہ دلائی ہے کہ صحابیات کی زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ عہد نبوی میں میدانِ جنگ میں شریک ہوکر خواتینمسلمانوں کے حوصلے بڑھاتی تھیں، زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں، انھیں پانی پلاتی تھیں لہٰذا ہماری یہ کوشش ہونی چاہیے کہ اسلامی دائرے میں رہتے ہوئے ہم بھی ملک وملت اور معاشرے کے لیے عملی قدم اٹھائیں اور طبقۂ نسواں کی ترقی کے تمام مواقع فراہم کریں کیونکہ خواتین کو نظرانداز کرکے سماجی ترقی ممکن نہیں ہے تاہم ترقی کے صیغہ میں اس بات کو بھی ملحوظ رکھیں کہ آزادی کے نام پر نئی نسل کو ایسی چھوٹ نہ دیں، جس سے شرمندگی کے احساس کو، بے حیائی اور عُریانیت کو فروغ ملے۔ سوسال پہلے کی ہدایت کا تجزیہ کریں تو اس کا ایک رُخ آج یہ سامنے آرہا ہے کہ اہلِ مغرب نے آزادی کے نام پر خواتین کا استحصال کیا ہے اور ایک طرح سے انھیں سرعام نیم برہنہ کردیا ہے۔ اس سے بھی بیگم سلطان جہاں کی دوراندیشی ثابت ہوتی ہے کہ وہ آزادی تو چاہتی تھیں مگر بے شری نہیں، ورنہ

آزادی اور برابری کا یہ کون سا تصور سامنے آرہا ہے کہ خواتین، اقتصادیات کا ذریعہ تصور کی جانے لگی ہیں، اور ان کے توسط سے اشتہارات کا غیر مہذب طریقہ استعمال کیا جانے لگا ہے۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ مشرقی خواتین، اہلِ مغرب کے مکر و فریب کا یوں شکار ہوئیں کہ وہ اشتہارات کا حصہ بننے میں فخر محسوس کرنے لگیں۔ افسوس کا مقام یہ ہے کہ ہندستانی معاشرے کا بھی وہی مزاج بنتا جا رہا ہے جو مغرب کا خاصہ رہا ہے۔ اب یہاں بھی عریانیت پاؤں پسار رہی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ بیگمات بھوپال خصوصاً نواب سلطان جہاں کی تعلیمات کے توسط سے نئی نسل کو اس وبا سے دور رکھا جائے اور اسے آزادی کا صحیح درس دیا جائے تا کہ ہمارا قابلِ فخر معاشرہ اور بھی توانا ہو سکے۔

یہ بیگم سلطان جہاں کی تعلیم و تربیت کا ہی اثر ہے کہ آج اکیسویں صدی کی خواتین اس جانب خصوصی توجہ دے رہی ہیں۔ انھوں نے اس مسئلہ پر ایک معرکتہ الآرا کتاب ''عفت المسلمات'' تالیف فرمائی جو پردہ کے متعلق منقولی و معقولی حیثیت سے جامع اور اکمل ہے لیکن بقول امین زبیری اس تیس سال میں اس غفلت کے تجربہ نے جو مسلمانوں میں بحیث القوم تعلیم نسواں کی طرف سے ہے سرکار عالیہ کو اس طرف مائل کر دیا کہ مسلمان عورتیں پردہ مروجہ کے لیے مکلّف نہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہندوستان کا یہ پردہ درحقیقت مردوں کے استبداد اور تسلط کی یادگار ہے جس کو احکام شرعی کی تاویلات کر کے مضبوط کر دیا گیا ہے۔ جس نے ان پر اس تعلیم کا دروازہ جو انسان کی انسانیت کے لیے لازمی ہے بند کر دیا ہے۔ وہ قدرت کے ان مشاہدات اور عینی تجربات سے محروم ہو گئیں جو انسان کی تکمیل انسـ کے لیے ضروری ہیں۔ ان کی صحت تباہ ہو چکی ہے اور قوائے جسمانی پیدائشی طور پر مضمحل ہو گئے ہیں۔ ان میں اس قسم کی نزاکت پیدا ہو گئی ہے کہ جس نے ان کے دلوں سے ہمت و جرأت کو نکال کر خوف اور وہم پیدا کر دیا ہے حتیٰ کہ وہ ایک خفیف خطرہ کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ وہ اس پردہ مروجہ کی وجہ سے فرائض تک ادا کرنے سے قاصر ہو گئی ہیں۔ ان کو وسعتِ معلومات اور تعلیم نظری کا کوئی موقع نہیں رہتا ہم جو اولوالعزم خواتین قومی و ملی ارتقا، تمدنی و معاشرتی اصلاحات اور اشاعتِ تعلیم میں حصہ لے سکتی ہیں اور اپنی عملی کوششوں سے قوم کی رفتارِ ترقی کو تیز کر سکتی ہیں، اس پردہ مروجہ کی وجہ سے مجبور محض ہیں۔ بلا شبہ ان کو اسلام کی ان

رعایتوں سے فائدہ اٹھانا چاہیے جو چہرہ اور کفین کھولنے کے متعلق ہے اور یہ وہ حدِ اعتدال ہے جس کو شریعت حقہ نے قائم کیا ہے اور جس کی مظہر کامل سرکار عالیہ کی ذات والا صفات تھی۔ اس کے آگے افراط کی حد ہے جس کا احکامِ الٰہی سے روگردانی کے بغیر عبور ناممکن ہے۔

نواب سلطان جہاں بیگم کے قابلِ قدر کارناموں میں سب سے زیادہ اہم کارنامہ تعلیم کی ترقی ہے، جو ان کی خصوصی توجہ کا مرکز بنی۔ حکومت کی باگ ڈور سنبھالتے ہی انھوں نے محسوس کیا کہ ریاست بھوپال علم کے میدان میں بھی بہت پیچھے ہے لہٰذا انتظامی امور کے ساتھ ساتھ انھوں نے اس جانب بھی خصوصی توجہ دی۔ اس صورت حال کے تعلق سے وہ تحریر فرماتی ہیں:

''ان انتظامات کے ساتھ صیغۂ تعلیم پر بھی میری نظر تھی اور جس طرح کہ ریاست کی مالی مشکلات مجھے پریشان کر رہی تھیں اسی طرح رعایا کی وہ غفلت جو تعلیم سے تھی، پریشان کیے ہوئے تھی۔ اگرچہ میں پہلے سے واقف تھی کہ رعایائے بھوپال کو تعلیم کی طرف مطلق دلچسپی نہیں لیکن جس وقت میں نے دورہ کیا اور مفصلات و شہر کے مدارس کی کیفیت دیکھی تو مجھے سخت مایوسی ہوئی۔ تمام لوگوں کو مفصلات میں کیا شہر میں بھی تعلیم جدید سے وحشت تھی اور جو تعلیم کا شوق رکھتے تھے وہ پرانے اور ازکار رفتہ نصاب کے دلدادہ تھے یا وظیفہ کے لالچ سے قرآن مجید اور قدرے عربی، فارسی پڑھ لیتے تھے اور اگر اس سے آگے بڑھتے تھے تو نصاب مروجہ کے دائرے میں عمر تمام ہو جاتی تھی۔ مشرقی علوم کی تعلیم بھی غنیمت ہوتی۔ اگر پنجاب یونیورسٹی کی اورینٹل فیکلٹی کا نصاب رائج کر دیا جاتا اور اس میں امتحانات ہوتے۔ یا مدرسۂ دیوبند ہی کی تعلیم پیشِ نظر ہوتی۔ حالانکہ سرکار خلد مکاں تعلیمی اخراجات فیاضی کے ساتھ کرتی تھیں اور ان اخراجات کو ضروری جانتی تھیں۔ وظائف کی بہت بڑی تعداد تھی جس سے طلبا کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ شہر و مفصلات میں متعدد مدارس تھے۔ میں نے یہ حالت دیکھ کر عزمِ مصمم کر لیا کہ جس طرح ممکن ہو گا میرے لیے رعایا کی

تعلیمی حالت کا درست کرنا سب سے ضروری اور مقدم امر ہے۔ اگر چہ ان سالوں میں کوئی نمایاں اصلاح نہیں ہوئی لیکن آئندہ کے لیے تدابیر سوچنے اور غور وخوض کرنے کے واسطے اسباب دریافت ہو گئے۔ میں نے خصوصیت کے ساتھ اس طبقہ پر نظر ڈالی جو جاگیرداران عمائد کا تھا یا جن کو مناصب سے بیش قرار تنخواہیں دی جاتی تھیں لیکن جس طرح رعایا کو تعلیم جدید سے نفرت تھی اسی طرح اس طبقہ میں بھی منافرت موجود تھی اور اس نفرت کے ساتھ تعصبات رسم ورواج کی پابندی نمائشی اور فضول اخراجات کی کثرت اس درجہ پر پہنچ گئی تھی کہ اس نے اخلاق ومعاشرت پر نہایت خراب اثر ڈالا تھا۔"

(حیات سلطانی۔ص،64)

جس ماحول میں نواب سلطان جہاں بیگم نے پرورش پائی اور قرب وجوار کی جو فضا دیکھی اس سے انھیں اس کا شدت سے احساس ہوا کہ کوئی بھی ملک یا قوم جدید تعلیم کے بغیر ترقی نہیں کر سکتی ہے اور اس میں بھی وہ فوقیت خواتین کو دینا چاہتی تھیں کہ تعلیم نسواں کے بغیر سُنہرے خواب مکمل نہیں ہو سکتے ہیں، ملک ترقی یافتہ نہیں ہو سکتا ہے۔ "سلک شہوار" کے دیباچہ میں لکھتی ہیں:

"میں عورتوں کی تعلیم کو بھی ایسا ہی ضروری سمجھتی ہوں جیسا کہ مردوں کی تعلیم کو۔ دنیا کی زندگی ایک گاڑی کی مانند ہے جس کا ایک پہیہ مرد ہے اور دوسرا عورت۔ ایک پہیہ صاف ہو، اور تیز چلتا ہو اور دوسرا پہیہ زنگ آلود تو زندگی کی گاڑی اچھی طرح چل نہیں سکتی۔ پس کامیابی اسی وقت ہو سکتی ہے جبکہ مرد اور عورت دونوں تعلیم یافتہ ہوں۔" (ص،1)

اُنیسویں صدی کا آخری زمانہ اور بیسویں صدی کا آغاز ہندوستان میں بیداری کا دور کہلاتا ہے۔ کشمکش اور تناؤ کا ہونا بھی لازمی تھا مگر سلطان جہاں بیگم نے تمام مخالفتوں کے باوجود خواتین کو جدید تعلیم کی جانب راغب کیا۔ انھوں نے نہایت منظم طریقہ سے مردوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ خواتین کی تعلیم کے لیے بھی رائے عامہ کو ہموار کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ عملی زندگی میں کامیابی اور کامرانی تبھی میسر ہو سکتی ہے جب میاں بیوی دونوں تعلیم یافتہ، نیک، مہذب اور صوم وصلوٰۃ کے

پابند ہوں، تبھی وہ ایک دوسرے کو بخوبی سمجھ سکیں گے اور بچوں کی بہتر رہنمائی کر سکیں گے۔ انھوں نے اکثر تاریخ کے حوالے سے اس مسئلہ کو اُجاگر کیا خصوصاً عورتوں کو جتایا کہ مسلمان عورتوں نے اسلام اور شعائر اسلام کا پابند رہ کر دنیا میں کیسے کیسے کارہائے نمایاں کیے اور علوم وفنون میں دستگاہ حاصل کی۔ ان کی تربیت وتعلیم نے ہی اولوالعزم اور مشہور اشخاص پیدا کیے۔ دور کیوں جایئے خود بھوپال میں اسی نتیجہ تعلیم پر نظر ڈالیے اور گذشتہ دونوں فرماں روا بیگمات کے حالات دیکھیے جو تعلیم کے اعلیٰ نتائج ہیں۔ لہٰذا تعلیم حاصل کرو اور پابند طریقۂ اسلام رہو تاکہ تمھاری قومی ترقی ہو اور تم کو ہر قسم کی کامیابیاں حاصل ہوں۔ بیگم صاحبہ نے عورتوں اور مردوں کی مساوات کے متعلق ایک تقریر میں اپنی رائے یوں ظاہر کی:

> ''خواتین! میں سمجھتی ہوں کہ یہ ایک بڑی غلطی ہوگی کہ عورتیں تمام ملکی اور تمدنی امور میں مردوں کی مساوات کا دعویٰ کریں ان کو اس دائرے سے باہر نہیں جانا چاہیے، جو دستِ قدرت نے ان کے چاروں طرف کھینچ دیا ہے نہ اس معاملے میں ان منطقی دلیلوں کی پیروی کرنی چاہیے جو اس مساوات کے متعلق کی جاتی ہیں۔ مستثنیٰ اور خاص مثالیں سب پر حاوی نہیں ہوتیں۔ ہر عورت چاند سلطانہ، رضیہ بیگم اور نواب سکندر بیگم نہیں ہو سکتی۔ صدہا سال میں تاریخ کوئی ایسی مثال پیدا کرتی ہے جو خداوند کریم کی قدرت کا محض ایک ثبوت ہوتی ہے ایسی مساوات سے گھر کی خوشیاں برباد ہو جاتی ہیں اور خانہ داری کا لطف جاتا رہتا ہے۔ ہاں جو حقوق خدا نے ایک دوسرے کے مقرر کر دیے ہیں ان کو مانگنا اور لینا چاہیے۔'' (بیگمات بھوپال، حصہ دوم)

اسی سلسلے میں نواب سلطان جہاں بیگم کی ایک معرکۃ الآرا تقریر مسلم گرلز انٹرمیڈیٹ کالج علی گڑھ کے ایک ایڈریس کے جواب میں ہوئی تھی جس میں حسبِ ذیل مضامین پر بحث ہوئی تھی:

(1) تعلیمِ نسواں کے متعلق عام طور سے قومی توجہ نہ ہونے کا تاریخی سبب۔

(2) عہدِ رسالت میں مردوں کے ساتھ ساتھ زنانہ تعلیم کا آغاز۔

(3) زمانہ حال میں عورتوں کی تعلیمی ضرورت کا احساس۔
(4) نصاب تعلیم کے متعلق اختلاف اور اس کے سہ گانہ حصص۔
(5) مخصوص اور قومی مدارس کی ضرورت۔
(6) مخلوط مدارس میں اسلامی تعلیم وتربیت کا فقدان۔
(7) ایسے نصاب اور معیارِ تعلیم کی ضرورت جس سے لڑکیاں پرائیویٹ طور پر استفادہ حاصل کر کے مسلم یونیورسٹی کے پرائیویٹ امتحانات میں شریک ہو سکیں۔
(8) علمی سند کی ضرورت۔
(9) قومی نصابِ تعلیم تیار نہ ہو سکنے پر افسوس۔
(10) مادری زبان ذریعۂ توسیع تعلیم۔
(11) تربیتِ اخلاق ذریعہ کتب وامثال۔
(12) تعلیم یافتہ لڑکیوں میں آزادی اور تقلید غیر کا رجحان۔
(13) آزادیٔ نسواں۔
(14) مسلمان کی حیثیت سے احکامِ اسلام کی پابندی کا لزوم۔
(15) آزادی کا صحیح مفہوم۔
(16) تقلید اور آزادی کا فرق اور معیارِ تہذیب۔
(17) مردوں سے تصادم ومقابلہ کا خطرہ اور اس کا مشتبہ نتیجہ۔
(18) قرآنِ مجید سے ترقی وفلاح کے اسباب۔
(19) عورت کا مقصدِ آفرینش۔
(20) تحفظِ وقار وناموس کے طریقے اور پردہ۔
(21) تبرج جاہلیت اور زمانہ موجودہ کا فیشن۔
(22) حجاب ستر کی تکلیف شرعی اور حیا کی تعریف۔
(23) تمدنی۔ معاشرتی اور علمی ترقیوں میں عورتوں کا حق اور حصہ۔
(24) عورتوں کی مذہبی تعلیم اور اس کی ضرورت۔

مسند نشین ہوتے ہی بیگم صاحبہ نے 'مدرسۂ وکٹوریہ' اور 'مدرسۂ بلقیسیہ' میں اصلاحات کیں۔ حساب، خانہ داری اور دستکاری کی تعلیم کا بھی فرمان جاری کیا۔ 1904 میں 'سلطانیہ اسکول' قائم کیا۔ اس میں دینی اور دنیاوی دونوں تعلیم کا معقول اہتمام کیا۔ قرآن پاک کی تجوید و قرأت اور حفظ کے لیے ''مدرسۂ حفاظ'' اور ''مدرسۂ عبیدیہ'' قائم کیا۔ 1905 میں صاحبزادی آصف جہاں کی وفات کی دائمی یادگار کے طور پر ''مدرسۂ طبیہ آصفیہ'' کا اعلان کیا۔ خالص طبی تعلیم کے اعتبار سے یہ ایک نمایاں اور قابلِ قدر کارنامہ تھا۔ جلد ہی لڑکیوں کی دست کاری کے لیے ''آصفیہ ٹیکنیکل اسکول'' کھولا گیا۔ 1922 میں اپنے مرحوم شوہر نواب احمد علی کی یاد میں ''جامعہ احمدیہ'' قائم کیا جو بعد میں اورینٹل کالج کے نام سے مشہور ہوا۔ مڈل اسکول کی حیثیت سے شروع ہو کر جلد ہی اس نے کالج کی حیثیت اختیار کر لی۔ پہلے اس کا الحاق دیو بند سے پھر الہ آباد یونیورسٹی سے ہو گیا۔ خاندان کی بچیوں کے لیے ''قصرِ سلطانی'' میں ''مدرسۂ سکندریہ'' قائم کیا، جس میں گرلس گائڈ کی ٹریننگ بھی دی جاتی تھی۔

دینی اور دنیاوی تعلیم کے لیے ''مدرسۂ سلطانیہ'' پر خصوصی توجہ دی گئی اور ''مدرسۂ حمیدیہ'' کا بھی معقول بندوبست کیا گیا۔ ہندی کے فروغ کے لیے ''برجیسیہ کنیہ پاٹھ شالا'' کا انتظام کیا گیا۔ ریاضی عام معلومات اور انگریزی کے اچھے اساتذہ رکھے گئے۔ اس پاٹھ شالا کے تعلق سے وہ فرماتی ہیں:

> ''ہندو لڑکیوں کے لیے جداگانہ مدرسہ قائم کرنے کی مجھے ایک عرصہ سے فکر تھی کیونکہ میں اپنی رعایا کو بلا امتیاز مذہب عزیز رکھتی ہوں اور فی الواقع کسی فرمانروا کو زیبا نہیں ہے کہ وہ اپنی رعایا کے مابین مذہبی رواداری یا امتیاز کو جہاں تک ترقی و اصلاح اور انصاف و امن کا واسطہ ہے جائز رکھے بلکہ ہر صورت میں مساوات قائم رکھنا چاہیے۔ اس لیے جس طرح مسلمان لڑکیوں کی تعلیم میں مجھے شغف ہے اسی طرح ہندو لڑکیوں کی تعلیم بھی میرا نصب العین ہے اور اگر میں خاص مذہبی ضرورتوں سے مجبور نہ ہوتی تو کبھی جداگانہ مدرسے قائم نہ کرتی۔ اگرچہ تعلیم دونوں کے لیے ایک

ہی پیمانہ اور طریقہ پر ہے مگر چونکہ ابتدائی درجوں میں مذہبی تعلیم کا حصہ زیادہ ہے پس لامحالہ دونوں کو ملا کر تعلیم نہیں دی جا سکتی۔ لہٰذا میں نے اس سال بر جیس جہاں بیگم سلمہا اللہ تعالیٰ کے عزیز نام سے موسوم کر کے ہندو لڑکیوں کے لیے ایک پاٹ شالا قائم کیا۔'' (عصر جدید بھوپال)

انھوں نے ہندوؤں کے قومی مدرسہ جین شوتامبر پاٹ شالا کی غریب لڑکیوں اور لڑکوں کے لیے مختلف وظائف مقرر کیے۔ انھیں حوصلہ دیا، ان کی عظمت کی تعریف کی اور پھر اسی مدرسہ کے جلسہ میں اپنے خیالات اس طرح ظاہر فرمائے:

''میں اس موقع پر ایک بات کہنا چاہتی ہوں جو شاید آپ کو بھی معلوم ہو کہ اس وقت ہندوستان میں جہاں کہیں ہندو لڑکیوں کے پاٹ شالے مدرسے اور یتیم خانے اچھی طرح چل رہے ہیں ان کے حالات جہاں تک میں نے دیکھے ہیں یہی معلوم ہوا ہے کہ عورتوں کی ہمت، لیاقت اور کوشش نے ان کو قائم کیا اور ترقی دی ہے۔ اکثر عورتوں نے تو اپنی زندگیاں وقف کر دی ہیں۔ یہ آپ بہنوں کی زندہ مثالیں ہیں اور مجھے امید ہے کہ بھوپال کی ہندو عورتیں بھی نیکی کے ان کاموں میں ایسی ہی ہمت اور کوشش کریں گی۔ میں ایسی پرائیویٹ اور قومی پاٹ شالاؤں وغیرہ کو بڑی عزت کی نظر سے دیکھتی ہوں کیونکہ یہ اپنی قوم کی ہمدردی کا ایک ثبوت ہوتا ہے اور اس سے دوسروں کے حوصلے بڑھتے ہیں۔''

ریاست اور ریاست کے باہر علم کی جلتی ہوئی شمع کو وہ اور بھی روشن کرنا چاہتی تھیں۔ وہ ایک ایسا نظام تعلیم رائج کرنا چاہتی تھیں جس میں دین واخلاق کو ایک نمایاں حیثیت حاصل ہو۔ ان کے اندر عوام میں علم کے حصول کے لیے جو للک تھی اور جو خدا ترسی کا مزاج تھا اس کی مثال مشکل سے مل سکتی ہے۔ محمد امین زبیری مدرسہ سلطانیہ کے تعلق سے لکھتے ہیں کہ:

''یہ مدرسہ انٹرنس تک الہ آباد کے سررشتہ تعلیم سے ملحق کیا گیا۔ منظور شدہ نصاب کے علاوہ قرآن مجید با ترجمہ کی تعلیم قرأت کے التزام کے ساتھ

اور دستکاری کی تعلیم لازمی رکھی گئی۔ ایمبولنس اور فرسٹ ایڈ یعنی زخمیوں کی تیمارداری اور فوری امداد کی تعلیم کا بھی ایک درجہ کھولا گیا، کامیابی کا اوسط بھی اچھا رہا۔ اور بہت تھوڑے عرصہ میں اس کی چند تعلیم یافتہ لڑکیاں استانی کی حیثیت سے کام کرنے لگیں۔ ٹریننگ کی ایک شاخ بھی کھولی گئی تاکہ معمولی نوشت وخواند جاننے والی عورتوں کو بھی مکتبوں اور مدرسوں میں تعلیم دینے کے قابل بنایا جائے اور اس طرح مکتبی تعلیم کے لیے معقول تعداد میں اسٹاف مہیا کیا جائے جس سے اشاعتِ تعلیم میں آسانی ہو اور جو مشکلیں معلمات کی کیابی سے ہیں وہ رفع ہوں۔ اس درجہ میں داخل ہونے والی عورتوں کے لیے خاص وظائف بھی مقرر فرمائے گئے دو سال کا نصاب ضروری مضامین کی تعلیم کا اور ایک سال کا معلّمی کا اصولی اور عملی تعلیم کا رکھا گیا۔'' (حیات سلطانی، ص،70)

13 دسمبر 1909 کو اسی مدرسہ کے جلسے میں حصول علم کی اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے جو حکیمانہ نکات پیش کیے، اس تقریر کا اقتباس بھی درج کیا جاتا ہے۔ یہ اقتباس آج بھی خواتین کے لیے قابلِ غور وفکر ہے:

''مجھے پہلے اس مدرسہ کے قائم کرتے وقت یہی دقتیں محسوس ہو رہی تھیں اور ابھی تک میری حسبِ مرضی تعلیم کی عام اشاعت نہ ہونے میں بھی مشکلات درپیش ہیں اگر استانیوں کی تعلیم کا انتظام ہوتا اور عمدہ نصاب تیار کرلیا جاتا تو بڑی حد تک یہ مشکلیں رفع ہو جاتیں تاہم بھوپال میں مدارس شہر کے لیے مسز بخش نے خود اسی مدرسہ کی لڑکیوں کو ٹرینڈ کیا اور ایک حد تک اس میں دقت نہیں ہوئی۔

خواتین! تمام پیشوں میں جو عورتیں اور مرد کرتے ہیں معلّمی کا پیشہ سب سے زیادہ شریف اور اعلیٰ ہے کیونکہ اس میں انسانوں کو بہت سے انسانوں کی سیرت اور عادات واخلاق اور آئندہ زندگی درست کرنے کا موقع ملتا

ہے لیکن افسوس ہے کہ استانی کا لفظ ہی حقیر سمجھ لیا گیا ہے اور شریف و ذی رتبہ خواتین اس پیشہ کو اپنے مرتبہ اور شرافت کی توہین سمجھتی ہیں حالانکہ اگر وہ خواتین جو زندگی کی ضروریات سے مستثنیٰ ہیں اور ان کو وقت اور فرصت حاصل ہے، اس پیشہ اور کام کو اختیار کریں تو وہ بھی اپنی بہنوں اور اپنی صنف کی بہت بڑی خدمت انجام دے سکتی ہیں اور وہ عورتیں جو اپنی مدد آپ کرنے کے لیے مجبور ہیں اس پیشہ کو اختیار کر کے ہم خرما وہم ثواب کا مصداق ہوسکتی ہیں۔

خواتین! میں سمجھتی ہوں کہ جو نصاب تعلیم عام طور سے زنانہ مدارس میں جاری ہے وہ ہماری قومی وملکی ضروریات کے لیے ناکافی ہے اور ہم کو ایک ایسا نصاب درکار ہے جو تمام ضرورتوں پر حاوی ہو لیکن یہ کام ملک کے قابل ترین اصحاب کا ہے اور افسوس ہے کہ باوجود ضرورت سمجھنے کے مسلمانوں نے اس پر مطلق توجہ نہیں کی۔ اب البتہ دس سال کی کوشش کے بعد چند کتابیں تیار ہوئی ہیں جو کچھ غنیمت معلوم ہوتی ہیں مگر جب تک سلسلہ مکمل نہ ہو جائے ضرورت پوری نہیں ہوسکتی تاہم جو کچھ تیار ہو گیا ہے اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔"

یہی خیالات سرکار عالیہ نے مختلف مواقع کی متعدد تقریروں میں ظاہر فرمائے ہیں اور ہنوز یہی دقتیں مسلمان عورتوں کی تعلیم میں ہر جگہ پیش آئی ہیں۔ انھوں نے اس مدرسہ میں ایک بورڈنگ ہاؤس بھی قائم کیا اور اس کے تقریباً کل مصارف صیغۂ تعلیم کے ذمہ رکھے گئے۔ اس مدرسہ کو جب 1911 میں لیڈی اُڈوائر نے معائنہ کیا تو تحریر کیا:

"اس مدرسہ میں ہر ہائینس کی گہری دلچسپی امرائے ریاست کے آئندہ نونہالوں کے لیے تعلیم یافتہ اور تمیز دار بیویاں مہیا کرنے میں بہت مفید ہوگی اور اس اسکول کے افتتاح میں ............وغیرہ کو بڑی عزت کی نظر سے دیکھتی ہوں کیونکہ یہ اپنی قوم کی ہمدردی کا ایک ثبوت ہوتا ہے اور اس

سے دوسروں کے حوصلے بڑھتے ہیں۔''

سرکار عالیہ کو جہاں اپنی قوم اور صنف کی دنیاوی ترقی مدنظر تھی۔ وہاں فلاح اُخروی کا خیال بھی ایک لمحہ کو جدا نہیں تھا اور چونکہ خود اعمال مذہب کی بے انتہا پابند تھیں اس لیے ہمیشہ عورتوں کی اس پابندی کی کمی کو افسوس کے ساتھ محسوس کیا اور اس قدیم مذہبی تربیت کو جو ہر مسلمان خاندان کا ایک جوہر تھا ضائع ہوتا دیکھ کر زیادہ رنج ہوا۔ اس احساس کی بنیاد پر بھوپال کے تمام مدارس میں اتنی مذہبی تعلیم جو ضروری ہوتی ہے لازمی کردی اور زنانہ مدارس میں قرآن مجید ترجمہ کے ساتھ داخلِ نصاب فرمایا لیکن اس کا دائرہ وسیع نہیں ہوسکا صرف بلدۂ بھوپال تک محدود رہا۔ یہ مسئلہ ہمیشہ بیگم صاحبہ کو فکرمند کرتا رہا اس لیے انھوں نے بھوپال میں نمونتاً وسیع پیمانہ پر مذہبی تعلیم کے لیے ایک زنانہ مدرسہ کی بناڈالنی ضروری تصور فرمائی لیکن اس سلسلہ میں جو پہلی دقت پیش آئی وہ یہ تھی کہ باوجود سعی بلیغ کے چند استانیاں بھی فراہم نہ ہوسکیں جو عورتوں کو مذہبی تعلیم دے سکیں اور نہ ایسی کتابیں دستیاب ہوئیں جو بطور کورس کے پڑھائی جاسکتیں تاہم ہمت عالی کا تقاضا یہی ہوا کہ ایسا مدرسہ قائم ہی کردیا جائے اور جو کتابیں بھی اس وقت میسر آئیں انہی سے تعلیم کا آغاز ہو چنانچہ 5 فروری 1927 / 2 شعبان 1345ھ کو عورتوں کے ایک نہایت عظیم الشان جلسہ میں اس مدرسہ کی افتتاحی رسم ادا کی گئی۔ اس موقع پر سلطان جہاں بیگم نے ایک مبسوط اور پُر مغز تقریر فرمائی جس کا اہم حصہ حسب ذیل ہے:

''خواتین! ہمارا سب کا عقیدہ ہے کہ اس دنیاوی زندگی کے بعد ایک اور زندگی آنے والی ہے اور وہ زندگی ایسی زندگی ہوگی کہ جس کی کوئی انتہا ہی نہیں ہے۔ اس زندگی کی تمام تر خوشی صرف ہمارے ان اعمال پر ہے جن کو ہم اس دنیا میں کرتے رہے ہیں اور جن کو ہم مذہبی اعمال کہہ سکتے ہیں مگر میں دیکھتی ہوں کہ ہماری پوری قوم مذہبی اعمال سے رو گرداں ہوتی جاتی ہے، مردوں پر ایک ایسی حالت طاری ہوگئی ہے کہ جس سے اس بات کا خطرہ پیدا ہوگیا ہے کہ اگر چندے وہ قائم رہی تو مذہب بھی رخصت ہوجائے گا۔ اسی حالت کا اثر عورتوں پر بھی پڑ رہا ہے جس کو میں نے جابجا

افسوس وحسرت کے ساتھ دیکھا ہے۔ بھوپال میں اس اثر کو پورے طور پر محسوس کر رہی ہوں۔ اور یہی وجہ تھی کہ اب سے دس سال پہلے آپ کے کلب کے جلسوں میں میں نے بذاتِ خود مذہبی تقریروں کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ میں نے اکثر اس بات کا خیال کیا ہے اور اس پر غور کیا ہے کہ آج کل نئی تعلیم یافتہ نسل میں مذہب سے بیگانگی کا کیا سبب ہے۔ میرے غور کا یہی نتیجہ ہے کہ اس کی ذمہ داری ہماری ہی صنف پر ہے کیونکہ جب ماؤں کی زندگی میں مذہب کا احترام نہ ہوگا اور وہ اعمال مذہب سے بیگانہ ہوں گی تو لامحالہ ان کی اولاد پر بھی یہی رنگ چڑھے گا۔ اب سے چوتھائی صدی پہلے عورتوں میں یک گونہ مذہبی پابندی موجود تھی اگر چہ ان میں ضعیف الاعتقادی بھی تھی تاہم وہ روزے نماز وغیرہ کی پابند تھیں مگر اب اس میں روز بروز کمی ہو رہی ہے اور یہ خطرہ صاف نظر آ رہا ہے کہ آئندہ نسل میں برائے نام بھی مذہب کی حرمت باقی نہ رہے گی''۔

وہ اپنی اس تقریر میں آگے فرماتی ہیں کہ:

''آج ہندوستان میں کہیں اور کسی جگہ بھی عورتوں کی مذہبی تعلیم پر توجہ نہیں کی جاتی اگر چہ علما مشائخ اور صوفیا کے بڑے بڑے گھرانے موجود ہیں مگر وہاں بھی بے پروائی نظر آتی ہے اور زیادہ افسوس یہ ہے کہ وہ قدیم تربیت بھی مفقود ہو رہی ہے جو اعمال مذہب کی پابندی کی ضامن تھی۔ یہ امر روز روشن کی طرح ظاہر ہے اور کسی دلیل کا محتاج نہیں کہ دنیا کی گاڑی ان ہی دو پہیوں سے چلتی ہے جو مرد اور عورت کے نام سے موسوم ہیں اگر ایک پہیہ بیکار ہو گیا تو ناممکن ہے کہ یہ گاڑی چل سکے اس لیے وہ تمام قابلیتیں اور صلاحیتیں جو مردوں میں ہونی چاہئیں عورتوں کے لیے بھی ضروری ہیں''۔

نواب سلطان جہاں بیگم نے اپنی کئی تحریروں میں اس جانب بھر پور توجہ دلائی تھی، جس کی

روشنی میں وہ تقریر میں مزید فرماتی ہیں کہ اسلام نے مرد وعورت دونوں کو مساوی طور پر اعمالِ مذہب سے مکلف کیا ہے اور ہمیشہ عورتوں نے ہر موقع پر اور ہر حیثیت سے اسلام کی عظیم الشان خدمتیں انجام دی ہیں انھوں نے اشاعتِ اسلام میں بھی حصہ لیا ہے اسلام کی حفاظت میں بھی وہ مردوں کے دوش بدوش ہیں۔ سیاسی خدمتیں بھی کی ہیں اور ان کے علمی کارناموں سے تاریخ اسلام کے اوراق مزین ہیں وہ علاوہ علوم کے تفسیر، حدیث وفقہ میں نہایت کامل گزری ہیں جس کا سلسلہ عہد رسالت سے ہی قائم ہو گیا تھا خود کاشانۂ نبوی سے اس کی مثال قائم ہوتی تھی۔

بیگم صاحبہ کو یہ مدرسہ بہت عزیز تھا۔ وہ ہر پل اسے کامیاب دیکھنے کے جتن کیا کرتی تھیں۔ ان کے دلی جذبات وخیالات مذکورہ تقریر میں جلوہ گر ہیں کہ:

> عہدِ رسالت سے لے کر جب تک مسلمان محاسنِ اسلام سے آراستہ رہے علم کی نشر واشاعت ان کا اولین مقصد رہا۔ آج یورپ جو علمی فضل وکمال کا گوہرِ آبدار ہے اس کی یہ آب وتاب اسلام کی ہی رہینِ منت ہے۔ جس طرح مسلمانوں کے زمانۂ عروج میں مردوں میں علم کی گرم بازاری اور رونق تھی اسی طرح عورتیں بھی زیورِ علم سے مزین ہوتی تھیں۔ وہ تمدنی اور معاشرتی ترقیوں میں برابر کی شریک تھیں یہ مسلمہ امر ہے کہ کسی قوم کا تمدن ومعاشرت اور کسی قوم کی ترقی اسی وقت ممکن ہے جبکہ مردوں کے ساتھ عورتیں بھی شریک ہوں کیونکہ جب ہم قوم کا لفظ کہتے ہیں تو اس کا اطلاق مردوں ہی پر نہیں ہوتا لیکن جب مسلمانوں کا دورِ تنزل شروع ہوا اور وہ اپنے محاسن سے عاری ہو چلے تو انھوں نے اسلامی تعلیمات کو پسِ پشت ڈال دیا تو مسلمان عورتوں کے مرتبہ اور وقار میں بھی فرق آنا شروع ہوا اور علم کا دروازہ بھی ان پر بند کیا جانے لگا یہاں تک کہ یہ نصف حصہ قوم علم سے محروم ہو گیا۔ غیر ممالک کی حالت سے قطع نظر کرکے صرف ہندوستان پر ہی نظر ڈالیے کہ اس گذشتہ صدی میں عورتوں کی جہالت کس حد تک پہنچ گئی تھی میں اور علوم کا تذکرہ نہیں کروں گی صرف علمِ مذہب ہی کو لیجئے اس

وسیع خطہ ہندوستان میں باوجود یہ کہ ہر جگہ مذہبی علم کا چرچا رہا۔ بڑے بڑے علمی مرکز قائم ہوئے لیکن عورتوں کی مذہبی تعلیم سے غفلت برتی گئی۔ اور میں کہوں گی کہ جان بوجھ کر اور ارادتاً ان کو مذہبی علم سے محروم کیا گیا کہ آج ہم کو وہ عورتیں جو تفسیر و حدیث سے واقف ہوں اس تعداد میں بھی نہیں مل سکتیں جن کا شمار انگلیوں پر ہو سکے۔ اگر اس طبقہ میں مذہبی تعلیم ہی ہوتی تو جو لامذہبی نظر آ رہی ہے نظر نہ آتی۔ کس قدر افسوس اور حیرت کا مقام ہے کہ ہماری صنف ایسی ضروری تعلیم سے اس قدر بے بہرہ ہو کہ کروڑوں کی آبادی میں چند افراد بھی نظر نہ آئیں اس لیے یہ مدرسہ اسلامیہ اس بڑے نقصان کو کسی نہ کسی حد تک ضرور پورا کرے گا اور ہم کو امید ہے کہ ہماری خواتین مذہبی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مختلف طریقوں سے اس کی اشاعت میں کوشش کریں گی اور زیادہ تر مذہبی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مختلف طریقوں سے اس کی اشاعت میں کوشش کریں گی اور زیادہ مذہبی معلمات کے فرائض انجام دیں گی۔ اس میں شک نہیں کہ اس مدرسہ کے ابتدائی انتظامات میں ضرور دقتیں ہوں گی اور ابتداً ذریعہ تعلیم صرف اردو زبان ہوگی لیکن رفتہ رفتہ فارسی اور عربی میں بھی انتظام ہو جائے گا۔"

اس تقریر کے ساتھ مدرسۂ حمیدیہ اسلامیہ کا آغاز ہوا اور ایک سال کے اندر امید سے زیادہ لڑکیاں داخل ہو گئیں۔

ان مدارس کے علاوہ عورتوں کے لیے ایک صنعتی مدرسہ بھی جاری کیا گیا جس کے اغراض و مقاصد خود سرکار عالیہ ہی کے الفاظ میں یہ تھے:

"وہ جاہل اور بے ہنر عورتیں جو وارث اور والی نہ ہونے سے اپنے اور اپنے بچوں کے گزارہ کے لیے محتاج ہو کر اپنی زندگی بے انتہا مصیبتوں میں بسر کرتی ہیں دراصل بہت زیادہ قابل رحم ہوتی ہیں اور ایسی عورتیں

اس طبقہ میں اکثر پائی جاتی ہیں جن کے مردوں کا دارومدار محنت ومزدوری
یا ملازمت پر ہوتا ہے۔ظاہر ہے کہ مردوں کے مرنے یا ناقابلِ کار
ہوجانے کے بعد کثیر العیالی کے سبب کوئی اور ذریعہ روزی کمانے کا باقی
نہیں رہتا۔اس لیے مجبوراً گرسنگی اور فاقہ کشی برداشت کرنی پڑتی ہے جس کا
یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ بنی نوع انسان کی ایک کثیر تعداد یا تو جرائم پیشہ ہوجاتی ہے
یا فاقہ کشی کی مصیبتیں اس کو موت کے کنارے کھینچ کر ڈال دیتی ہیں"۔

مہتمم تاریخ، محمد امین زبیری مارہروی نے کئی جگہ اس کی وضاحت کی ہے کہ بھوپال میں بھی اس قسم کی بے ہنر عورتوں کی کمی نہ تھی لیکن ان پر وہ صعوبتیں نہ تھیں جو عام طور پر دوسری جگہ پائی جاتی ہیں۔اس کی وجہ صرف زنانہ حکومت کی فیاضی اور بالخصوص والیانِ ریاست کی وہ اعلیٰ اور مشہور فیاضی ورحم دلی تھی جس کی یاد ہمیشہ باقی رہے گی مگر فقر وفاقہ کو کسی فیاض کی فیاضی نہیں روک سکتی اور نہ داد و دہش۔ بیگم سلطان جہاں صاحبہ کا کہنا تھا کہ وہ اصلی مصیبتیں جو افلاس کا نتیجہ ہیں دور ہوسکتی ہیں بشرطیکہ لوگ اپنے آپ کو خود نکما اور اپاہج بنانہ لیں دراصل وہ اپنی معاش کا بار خزانہ پر ڈالنا چاہتے ہیں اور یہی سبب ہے کہ میں نے ریاست میں ایک بڑا گروہ اس قسم کی عورتوں کا پایا اس لیے مجھے سخت ضرورت محسوس ہوئی کہ میں اور اصلاحات کے ساتھ اس طبقہ کی بھی اصلاح کروں تا کہ آئے دن کی مصیبتوں میں کچھ تو کمی ہو۔اسی لیے میں نے بھوپال کی ایسی عورتوں کے لیے ایک ایسا مدرسہ جس میں ضروریاتِ روزمرہ میں کام آنے والی چیزوں کی صنعتی تعلیم دی جائے۔قائم کرنا تجویز کیا تا کہ اس میں صنعت وحرفت سیکھ کر کچھ نہ کچھ اپنی مدد کرسکیں۔

یہ مبارک واعلیٰ جذبات ہمدردی دراصل رحمتِ خداوندی ہیں جن سے خوش قسمت مخلوق ہی بہرہ مند ہوتی ہے۔ وقتاً فوقتاً اس اسکول کو ترقی دی گئی اور 1926 میں اعلیٰ حضرت فرماں روائے بھوپال کی سالگرہ مبارک کی تقریب سعید پر جدید[1] اسکیم نافذ ہوئی جس میں دستکاری کے سلسلہ کو وسیع کیا گیا، نقاشی، مصوری، چینی و پانی نقش ونگار، چمڑے کے کام، صابن وعطر سازی تک کو وسعت دی گئی۔ سائنٹفک طریقہ سے اچار، چٹنیاں، مٹھائی بنانے کے لیے ایک خاص شعبہ کھولا گیا۔مختلف مدارس کی طالبات کے لیے حفظانِ صحت، بچوں کی خبر گیری، خانگی تیمار داری، عام

تندرستی، گرل گائڈ، اور ایم بولینس کا اضافہ ہوا۔ یہ اسکیم قیامِ لندن کے زمانہ میں سرکار عالیہ کے پیش نظر تھی۔

یہ اسکول اور یہ اسکیم سرکار عالیہ کے ان اعلیٰ جذبات کے مظہر ہیں جن کو بیگم سلطان جہاں نے اس موقع پر ان الفاظ میں ظاہر فرمایا تھا:

> ''کون انکار کر سکتا ہے کہ انسانی مصائب میں سب سے زیادہ مصیبت افلاس ہے اور افلاس بھی اس صنف کا جو بے کس و بے یار و مددگار ہو، اس لیے یہ سب سے بڑی نیکی ہے کہ ان کی مصیبتوں کو دور کرنے کی کوشش کی جائے۔''

1906 میں ''فوجی رائڈنگ اسکول'' قائم کیا جو بعد میں ''ہارڈنگ ملٹری اسکول'' کے نام سے مشہور ہوا۔ دنیاوی علوم خصوصاً حساب، عام معلومات اور سائنسی مضامین کے علم کے لیے ''الگزینڈر اسکول'' کھلوایا جو بہت جلد ترقی کر گیا۔ شیخ محمد عبداللہ بانی گرلس کالج، علی گڑھ اپنے ماہنامہ رسالہ ''خاتون'' کے شمارہ بابت فروری 1910 میں لکھتے ہیں:

> ''الیگزینڈرا ہائی اسکول کا ایک جلسہ بیگم صاحبہ بھوپال کی سالگرہ کی تقریب میں منعقد ہوا تھا۔ اس جلسے میں جاگیرداران ریاست کی ایک بڑی تعداد اور اکثر طلبائے شہر اور ان کے سرپرست شریک تھے۔ ہر ہائینس صدر انجمن تھیں۔ پہلے مسٹر پین اسکول مذکور کے پرنسپل نے ایک تقریر کی جس میں اہل مدرسہ کی طرف سے سالگرہ کی مبارکباد دی پھر طلبا اور ان کے سرپرستوں کے فرائض کے متعلق کچھ ہدایتیں فرمائیں۔ اس کے جواب میں ہر ہائینس نے یہ تقریر فرمائی جس کی اس نمبر میں درج کرنے کا ہم کو فخر حاصل ہوا۔''

اس تقریر کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف سے بیگم سلطان جہاں کی علمی دلچسپی اور روشن دماغی کا ثبوت ملتا ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کی تعلیم اور طریقہ تعلیم کے متعلق بہت غور کیا تھا۔ طلبا کی اخلاقی نشو و نما، مذہبی تعلیم اور معاشرتی تربیت پر بہت زور دیا ہے۔

درحقیقت یہی امور تھے جن کی طرف سے لاپرواہی برتنے سے ماضی قریب سے بعید تک یونیورسٹی کی تعلیم زیادہ مفید نہیں ثابت ہوئی اوران میں سے ایسے طلبا بہت کم نکل سکے جو تعلیم یافتہ انسان کا صحیح نمونہ کہے جاسکیں۔البتہ بھوپال کے لوگ زمانہ دراز سے تعلیم سے غافل رہے تھے۔وہاں کے لوگوں کا آبائی پیشہ فن سپہ گری تھا اگر چہ ان میں اسلامی سادگی اور مذہب کی عظمت اور پابندی یہ سب صفات حسنہ بدرجۂ اتم موجود تھیں۔لیکن تعلیم نہ حاصل کرنے کے باعث اولوالعزمی، بے تعصبی اور آپسی میل جول کی وسعت ان کے دماغوں میں بہت کم رہ گئی تھی۔بیگم سلطان جہاں کی ان مربّیانہ کوششوں سے اہل بھوپال کے دل ودماغ میں روشن دلی پیدا ہوئی اور تعلیم وتربیت کی برکتوں سے وہ بھی مالا مال ہوگئے۔شیخ محمد عبداللہ اس سلسلہ میں دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر ہائینس بیگم صاحبہ جیسی روشن دل اور مہربان حکمراں کے اقبال اور عمر کو بڑھائے اور عرصہ دراز تک وہ اپنی خوش قسمت رعایا کے سر پر سایہ افگن رہیں(رسالہ''خاتون'' کے اکثر شماروں میں یہ دعائیہ کلمات ہیں)۔

اسی دوران بیگم صاحبہ نے لیڈی لینسڈ ون اسپتال قائم کیا جو بعد میں لیڈی منٹو کے نام سے منسوب ہوا۔اس میں دائیوں کی تعلیم کا خاص بندوبست تھا۔جو دائیاں موروثی طور پر یہ پیشہ کرتی تھیں ان کے لیے زنانہ ڈاکٹر کے پاس جا کر زبانی تعلیم حاصل کرنا لازمی قرار دیا۔طبّی ضرورتوں کو محسوس کرتے ہوئے بیگم صاحبہ نے انگریزی طرز پر نہایت فیاضی وتوجہ کے ساتھ ایسے مختلف انتظامات کیے کہ عورتیں اور بچے ان تکالیف سے محفوظ رہیں۔سب سے پہلے ایک نرسنگ اسکول کا اضافہ کیا۔اس تعلیم کی اہمیت کی نسبت''اختر اقبال''میں تحریر فرمایا ہے کہ:

> ''مریضوں کے لیے جس طرح قابل طبیب وڈاکٹر اور بہتر ادویات کی ضرورت ہے اسی طرح باقاعدہ اور عمدہ تیمار داری ضروری چیز ہے لیکن ہندوستان میں اس ضروری چیز پر بہت کم توجہ ہوتی ہے اور عموماً دیکھا جاتا ہے کہ تیمار داری نہایت بے قاعدہ اور خراب طریقہ سے کی جاتی ہے۔میں نے جہاں تک غور کیا اس کی وجہ طریقۂ تیمار داری سے عدم واقفیت ہے۔تیمارداری کو یورپ نے بجائے خود ایک مستقل فن بنادیا ہے

جس کو عورتیں با قاعدہ طور پر حاصل کرتی ہیں اور وہ امرا اور خوشحال آدمیوں کے گھروں میں نرس کی خدمت بجالاتی ہیں اور چونکہ وہ اسی کے ساتھ اور دوسرے زنانہ فنون میں دستگاہ رکھتی ہیں اس لیے اکثر بچوں کی پرورش و تربیت بھی ان ہی کے سپرد کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ تمام یورپین عورتیں خواہ وہ کسی درجہ کی ہوں اس کام سے کچھ نہ کچھ واقف ہوتی ہیں اور یہ واقفیت زیادہ تر ان کی تعلیم کا نتیجہ ہوتی ہے اور اعلیٰ مرتبہ کی لیڈیاں اس کو نہایت شوق سے سیکھتی ہیں لیکن ہندوستان میں یہ قابلیت مفقود ہے۔ نہ یہاں نرسنگ اسکول ہیں اور نہ عورتوں کی تعلیم اس درجہ عام اور ترقی پر ہے کہ وہ بطور خود واقفیت پیدا کرلیں اس لیے تیمارداری کی خرابی کا آخری نام "موت" ہے۔"

یہ مدرسہ لیڈی منٹو کے نام سے موسوم ہوا۔ پانچ برس سے زیادہ عمر کی لڑکیاں داخل کی گئیں اور عموماً سب کو وظیفہ عطا کیا گیا۔ اس اسکول کے ساتھ دائیوں کی تعلیم کا انتظام کیا اور ایک درجہ وکٹوریہ میموریل اسکالرشپ کلاس کے نام سے قائم فرمایا۔ اس انتظام میں بہت مشکلات پیش آئیں۔ انتظام کی تو فوری ضرورت تھی کیونکہ ولادت تو روز ہی ہوتی ہے اور تعلیم کے لیے ایک عرصہ درکار تھا لہٰذا یہ انتظام کیا گیا کہ وہ دائیاں جو موروثی طور پر پیشہ کرتی ہیں، ان کی تربیت کرائی جائے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ نواب سلطان جہاں بیگم نے "عابدہ چلڈرن ہاسپٹل" قائم کیا۔ انھوں نے اس کے فاؤنڈیشن کے وقت جو تقریر فرمائی تھی۔ اور اس میں بچوں کے متعلق جو کچھ کہا تھا وہ بیگم صاحبہ کے ان خیالات کا مرقع ہے جو اس شفا خانہ کے محرک ہوئے۔ فرمایا کہ:

"حضرات! یہ کلیہ ہر شخص جانتا ہے کہ قومیں بچوں ہی سے بنتی ہیں اور آج جو بچہ اس فضا میں سانس لیتا ہے وہی کل ایک ایسی ہستی ہوگا جو قومیت اور انسانیت کی تعمیر کرے گا۔ اسی کلیہ کو پیش نظر رکھ کر تمام متمدن اور تعلیم یافتہ ممالک میں بچوں کی تندرستی اور صحت کے متعلق یوم ولادت ہی سے خاص توجہ کی جاتی ہے اور نرسنگ کی تعلیم فرائض مادری میں داخل ہے اور کوئی ماں

اس وقت تک ماں کہلانے کے لائق نہیں جب تک کہ وہ اپنے فرائض سے واقف نہ ہو۔ یوں تو بچوں کے ساتھ ماں اور باپ کی محبت ایک فطری جذبہ ہے اور وہ اس کی صحت کے دل سے متمنی ہوتے ہیں مگر وحشی یا نیم تعلیم یافتہ قومیں ان کو محض واقعات و اتفاقات پر چھوڑ دیتی ہیں اور تعلیم یافتہ قومیں تدبیر کے ساتھ تقدیر پر بھروسہ کرتی ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ متمدن ممالک میں بچے توانا اور قوی ہوتے ہیں اور جن بچوں پر امراض کا حملہ ہوتا ہے ان کے لیے گھروں کے علاوہ اس قسم کے شفا خانے موجود ہیں جیسا کہ میں نے ابتدا میں تقریر میں بیان کیا ہے۔ لہٰذا اسی بنیاد پر میں نے نرسنگ کی تعلیم کے لیے مختلف ذرائع اختیار کیے اور اب ایک چلڈرن ہسپتال یعنی شفا خانہ اطفال قائم کرنے کا ارادہ کیا ہے جس میں مریض بچے داخل کیے جائیں گے اور وہیں ان کی تیمارداری ہوگی۔''

(بیگم سلطان جہاں، ص،60)

انھوں نے زچہ بچہ کی دیکھ ریکھ کے ساتھ ان کی صحت پر پورا دھیان دیا۔ اچھے شفا خانوں کے ساتھ معقول دواؤں اور غذا کا بھی خیال رکھا۔ مختلف زاویوں سے اس پہلو پر توجہ دی۔ تحریر و تقریر سے بھی کام لیا۔ اس موضوع اور ان اصول پر بیگم صاحبہ کی سب سے پہلی کتاب ''تندرستی'' ہے جو 1914 میں شائع ہوئی اس کے بعد آخر وقت تک یہ سلسلہ قائم رہا۔ سرکار عالیہ نے ان کتابوں کے دیباچوں میں اپنی قوم اور ملک کے مصنفین و مولفین کو بھی قوی ضرورت جتا کر اور غیرت دلا کر ایسی تصانیف و تالیفات کے لیے دعوتِ عمل دی ہے۔ چنانچہ وہ کتاب ''تندرستی'' کے دیباچہ میں تحریر فرماتی ہیں کہ:

''ہندوستان میں تعلیم کی اشاعت ہوئے ایک صدی گزر گئی اور ایک حد تک کامیابی بھی ہو رہی ہے لیکن عورتوں کی تعلیم میں وہ دلچسپی و کوشش نہیں جس کی ضرورت ہے خصوصاً مسلمانوں میں تو تعلیمِ نسواں کے ابتدائی مرحلے بھی ہنوز طے نہیں ہوئے اور ہماری قوم ابھی تک معیار و نصاب ہی

کے مباحث عالیہ میں مصروف ہے اور اس وقت تک مسلمان عورتوں کی
تعلیم کا آخری درجہ صرف اردو کی معمولی کتابیں پڑھ لینا اور خط لکھ لینا
ہے۔" (بیگم سلطان جہاں، ص،3)

وہ عوام وخواص کو بیدار کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ یہ بھی کچھ کم نہ ہوتا اگر قوم کے ذی علم اہلِ قلم ان کے لیے اس قدر تکلیف گوارا کرتے کہ ان کے فرائض کے متعلق کچھ کتابیں تصنیف کر دیتے جن سے وہ اپنی معلومات میں ترقی کرتیں اور ان کو ضروریاتِ زندگی میں مدد ملتی۔ وہ ذہنوں کو جھنجھوڑتے ہوئے سوالات قائم کرتی ہیں کہ وہ قوم کیوں کر زندہ قوم کہلانے کی مستحق ہے جس کی نصف تعداد جاہل ہو وہ یہ بھی کہتی ہیں کہ اس قوم کے ذی علم اور قابل افراد کیوں کر فخر کر سکتے ہیں جبکہ وہ اپنے علم اور اپنی قابلیت سے فائدہ نہ پہنچائیں؟ گھر گھر علم کی دستک نہ دیں۔ ہماری قوم کے مصنفین کی اس بے توجہی کا کیا ٹھکانا ہے کہ چھ سال میں باوجود سرمایہ ہونے کے وہ ابتدائی نصاب بھی تیار نہ کر سکے:

"میں نے نہایت غور اور تجربہ کے بعد یہ رائے قائم کی ہے کہ مسلمان
عورتوں کے لیے مذہبی تعلیم کے بعد سب سے زیادہ ضروری تعلیم حفظان
صحت، خانہ داری، نرسری اور ڈاکٹری کی تعلیم ہے اور اسی تعلیم پر ہماری
قوم کی جسمانی تربیت اور جملہ ترقیوں کا دارومدار ہے اور یہ تعلیم بھی اپنی
مادری زبان میں ہونا ضروری ہے کیونکہ کوئی قوم اس وقت تک ترقی
حاصل نہیں کر سکتی جب تک اس کی مادری زبان میں علمی ذخیرہ نہ ہو اور یہ
وہ کلیہ ہے جس کو ہم مغرب اور مشرق دونوں جگہ مشاہدہ کر رہے ہیں۔"

ماضی میں ہی نہیں آج بھی یہ مضامین ایسے ضروری اور اہم ہیں کہ عورت کو کسی نہ کسی وقت مراحل زندگی میں ان کی واقفیت کی ضرورت پیش آتی ہے اس لیے ہر تعلیم یافتہ خاندان کا یہ فرض ہونا چاہیے کہ وہ اپنے خاندان کی لڑکیوں کو جدید مضامین کی تعلیم دلائے اسی خیال سے نواب سلطان جہاں بیگم نے اہم معاملاتِ ملکی اور مشاغل ضروری سے وقت بچا کر انگریزی کی چند بہترین کتابوں سے ان مضامین کو منتخب کر کے اور تجربات اور معلومات کو بڑھا کر چند رسالے

مرتب کرنے کی کوشش کی ہے جن میں سے پہلا رسالہ ''حفظانِ صحت'' ہے جو امراض متعدی سے حفاظت اور تیارداری کے مضامین پر مشتمل تھا اس تعلق سے وہ کہتی ہیں کہ:

''چونکہ میں اپنے ملک اور اپنی قوم میں تعلیم نسواں کی بہ دل وجاں حامی ہوں اور میری عین تمنا اور آرزو یہ ہے کہ میں عورتوں کو اس تعلیم سے بہرہ ور دیکھوں جو ان کے لیے سخت ضروری ہے اس لیے میں اس رسالے کو طبع کرا کر شائع کرتی ہوں۔ میں خود سمجھتی ہوں کہ یہ رسالہ مکمل حیثیت میں نہیں ہے اور ابھی بہت کچھ اس میں اصلاح کی ضرورت ہے مگر یہ کمی ایسے ہی شخص کی محنت اور ہمت سے پوری ہوسکتی ہے جو ان مضامین میں ماہر ہو اور اس کے دل میں ہمدردی ہو۔''

اُن کا خیال تھا کہ ممکن ہے کہ اس رسالہ کے معائنہ کے بعد دانشور حضرات کچھ عبرت حاصل کریں اور چند ذی علم اور لائق اصحاب اس قسم کی کتابیں تیار کرنے کی طرف متوجہ ہو جائیں اور ایک مکمل سلسلۂ نصاب تیار کردیں۔ وہ اپنی طویل تقریر میں صاف طور پر اعلان کرتی ہیں کہ دربار بھوپال ہمیشہ ایسی مفید تصنیفات وتالیفات کی امداد کے لیے آمادہ ہے۔ پھر ''خانہ داری'' حصہ اول کے دیباچہ میں خواتین کو یوں دعوت دی جاتی ہے:

''میں جب انگریزی میں اس قسم کی کتابوں کو دیکھتی ہوں تو اس وقت میری یہ حسرت بہت بڑھ جاتی ہے ان ہی کتابوں کے سلسلہ میں میری نظر سے ایک کتاب گزری جس کا نام ''بک آف دی ہوم'' ہے جو 6 جلدوں میں شائع کی گئی ہے اور قریبا دو ہزار صفحے ہیں۔ اس کتاب میں کسی بات کو جو خانہ داری کے متعلق ہو خواہ وہ کیسی ہی جزئیات میں کیوں نہ داخل ہو نہیں چھوڑا گیا۔ میں نے اس کا ترجمہ کرایا اور پھر ترجمہ کو بالاستیعاب دیکھا، جوں جوں میں ترجمہ دیکھتی تھی میرا شوق بڑھتا جاتا تھا اور بے اختیار دل چاہتا تھا کہ ایسی ہی کتاب اردو میں بھی ہو جس سے اردو داں خواتین فائدہ حاصل کرسکیں لیکن اس کام کو میں نے اپنی طاقت سے باہر پایا

کیونکہ مجھے اپنے فرائض حکومت سے جو احکم الحاکمین کی طرف سے میرے ذمہ عائد کیے گئے ہیں اتنی فرصت ملنی دشوار کہ میں اپنی توجہ ایسی تصنیف و تالیف کی طرف مبذول کر کے نئے نئے اصول قائم کروں مگر چونکہ میں نے اس امر کو بھی اپنا قومی اور ملکی فرض سمجھا ہے کہ جب تک مجھے ذرا بھی فرصت ملے کچھ نہ کچھ ملک و قوم کے لیے اور خصوصاً خواتین کے لیے وقت صرف کروں۔ اس بنا پر میں نے ''بک آف دی ہوم'' اور مثل اس کے دوسری کتابوں کو پیش نظر رکھ کر اس کام کو شروع کر دیا ہے مجھے امید ہے کہ اس سے خواتین فائدہ حاصل کریں گی اور قابل و عالم اصحاب کے لیے یہ کتاب ایک نمونہ ہوگی کہ وہ اس قسم کی تصنیفات و تالیفات میں مصروف ہوں اور اس سے بہتر مکمل چیز ملک و قوم کے سامنے پیش کریں۔'' (ص،2)

اسی کے ساتھ سرکار عالیہ نے اشاعتِ کتب کی مالی امداد یا مطبوعہ کتابوں کے کثیر نسخے خرید کر نقد انعام عطا کیے اور مصنفین و مؤلفین کی حوصلہ افزائی کی خصوصاً مصنف خواتین اس فیاضی سے زیادہ اور ہمیشہ متمتع ہوئیں۔ شیخ عبداللہ نے رسالہ ''خاتون'' میں اس کا بار بار اعتراف کیا ہے کہ سرکار عالیہ کی یہ کوشش بے حد کارگر ہوئی اور آج 1913 کے مقابلہ میں ہم اس موضوع پر کثیر لٹریچر پاتے ہیں جو اس سے پہلے بہت ہی کم نظر آتا تھا۔ محسنِ نسواں نے اس سلسلہ کے ساتھ بچوں کے لیے بھی اخلاقی اسباق کا ایک سلسلۂ کتب شائع فرمایا۔ اس سلسلہ میں باغِ عجیب اور اخلاق کی چار ریڈریں نہایت دلچسپ ہیں۔ جس ضرورت سے یہ کتابیں تیار ہوئی ہیں اس کو اخلاق کی پہلی کتاب کے دیباچہ میں وہ یوں اُجاگر کرتی ہیں:

''اگر چہ اخلاقی سبقوں کا یہ سلسلہ میں نے اپنے خاندان کے بچوں کے لیے شائع کیا ہے لیکن میرا یہ مدعا ہے کہ اور بچوں کو بھی اس سے فائدہ پہنچے۔ اردو میں اس موضوع پر بہت کم کتابیں ہیں جو نصاب کے طور پر کام آئیں حالانکہ ضرورت ہے کہ بکثرت ایسے سلسلہ ہوں جو مسلمانوں کے

مدرسوں کی ابتدائی جماعتوں میں پڑھائے جائیں اور جہاں ایسے مدرسے
نہ ہوں وہاں گھروں پر التزام رکھا جائے۔ میں نے اس کتاب میں سبقوں
کو خالص مذہبی نقطۂ نظر سے لکھا ہے کیونکہ انسان کے دل پر وہ بات جلد
اثر کرتی ہے جو مذہب کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہو اسی لیے میں نے جابجا
آیات واحادیث سے کتاب کو زینت دی ہے اور مثال کے لیے مسلمانوں
کے صحیح اور تاریخی واقعات لکھے ہیں۔ میری رائے میں ابتدا سے بچوں کو
چھوٹی چھوٹی آیتیں اور حدیثیں ازبر ہونی چاہئیں تاکہ وہ موقع بہ موقع
اس کو استعمال کریں جس سے تقریر تحریر میں زور پیدا ہو جاتا ہے اور اس
سے ان کو اپنی مقدس کتابیں زیادہ دیکھنے اور یاد کرنے کا شوق پیدا
ہوگا۔ بہرحال میں نے ان مقاصد کو ملحوظ رکھ کر یہ خاکہ تیار کیا ہے اور مجھے
اس سے زیادہ کوئی خوشی نہ ہوگی کہ اپنی قوم کے قابل ترین اشخاص کے قلم
سے قوم کے بچوں کے لیے ایسی کتابیں دیکھوں۔
امید ہے کہ میرا یہ ناچیز تحفہ میری قوم کے بچوں کے لیے کارآمد ہوگا اور ان
کے والدین اس کو دیکھ کر مجھے دعائے خیر سے یاد کرتے رہیں۔ میں خدا
سے دعا کرتی ہوں کہ میرے خاندان اور قوم کے بچوں کو اس پر عمل کرنے
کی توفیق ہو۔" (ص،3-1)

بیگم سلطان جہاں نے خواتین کی تعلیم وتربیت، بچوں کی نگہداشت اور پرورش کے ساتھ ساتھ بہتر صحت کے لیے نئے اسپتال اور شفا خانے کھلوائے، پُرانے اسپتالوں کی توسیع کی۔ ان کے قرب وجوار کا ماحول صاف ستھرا رکھنے کے جتن کیے۔ ذہنی سکون کے لیے 'کلب' کھلوائے۔ خواتین کی ان تفریح گاہوں میں بھی تقریروں اور مضمونوں کے مقابلے ہوتے اور کامیاب خواتین کو انعامات عطا کیے جاتے۔ بغیر کسی دباؤ کے حفظانِ صحت، پرورشِ اولاد اور دوسری ضروریات کے متعلق معلومات بہم پہنچانے کے لیے لیڈی ڈاکٹر وقتاً فوقتاً لیکچر دیتیں اور ایسے لیکچروں میں ممبر خواتین کی شرکت کو لازمی قرار دیا جاتا تاکہ دوسروں کے حوصلے بڑھ سکیں۔ یہ کام بہت مشکل تھے

مگر سرکار عالیہ نے براہِ شفقت کلب میں مدرس ٹریننگ کلاس بھی جاری فرمایا جس کی وقعت و ضرورت خود اس کے نام سے ظاہر ہے۔انھوں نے اس کلب کی ممبر خواتین کے لیے خواہ بلحاظ امارت وثروت کسی درجہ کی کیوں نہ ہوں لازم کر دیا گیا کہ جلسوں میں ان کا لباس سادہ رہے اس احکام اور عملی اقدام نے مثبت سوچ پیدا کی۔ زرق برق لباس کی جگہ بیگمات سادہ لباس پہننے لگیں اور اُن کا بے تکلفانہ برتاؤ قابلِ رشک ہونے لگا۔سرکار عالیہ نے اس کلب کو صرف تفریح و دلچسپی کا ذریعہ نہیں بنایا بلکہ عملاً عورتوں کی ایک مفید سوسائٹی بنائی اور جب اٹھارھویں سال گرہ جلوس کے موقع پر خواتینِ کلب نے ایڈریس پیش کیا ہے تو اس کے جواب میں بیگم سلطان جہاں نے اپنی تقریر میں ایسی سوسائٹیوں اور کلب کا اصل مقصد خواتین کے ذہن نشین کیا تھا کہ:

> ''خواتین! عمدہ سوسائٹی ہمیشہ انسانی اخلاق کو جلا بخشتی ہے اور اگر اسی کے ساتھ تعلیم بھی ہو تو نورٌ علیٰ نور ہو جاتی ہے۔ میں خود محسوس کرتی ہوں کہ اس کلب نے آپ کے گروہ میں ایک عظیم تغیر پیدا کر دیا ہے اور مجھے کوئی شبہ نہیں ہے کہ خواہ رفتارِ ترقی تیز نہ ہو لیکن اس سے ایک حد تک تو وہ اغراض پورے ہو رہے ہیں جو اس کے قائم کرتے وقت قرار دیے گئے تھے۔ اس بات کو بھی کبھی بھولنا نہیں چاہیے کہ کلب اور سوسائٹیاں عموماً کسی اصلاح یا ترقی یا کسی اور عمدہ مقصد کے لیے قائم کی جاتی ہیں اور وہ عموماً شریفانہ مقصد ہوتے ہیں لیکن اگر اس کو نمود و نمائش فیشن و خود بینی کا مرکز بنا لیا جائے تو وہ مقاصد پورے نہیں ہوتے بلکہ برعکس نتائج نکلتے ہیں یا اگر صرف سیر و تفریح کا ہی مقام قرار دے لیا جائے اور اس میں ہمدردانہ کاموں کے متعلق تبادلۂ خیالات نہ کیا جائے یا کوئی اور مقصد پیشِ نظر نہ رکھا جائے تو وہ تضیع اوقات کی جگہ ہوتی ہے۔''

1 اگر چہ سرکار عالیہ نے اپنے زمانۂ حکومت میں اس انسٹی ٹیوشن کے لیے گراں قدر امداد منظور فرمائی تھی لیکن اس کی توسیع کے لحاظ سے اعلیٰ حضرت فرمانروائے بھوپال نے اس موقع پر چودہ ہزار روپیہ سالانہ کا اور اضافہ فرمایا۔ (محمد امین زبیری مارہروی)

# تصنیف و تالیف

ریاست بھوپال نے تعلیم کے تعلق سے بڑے پیمانے پر مختلف دائروں میں کام کیے۔ محکمۂ تصنیف و تالیف کا مقصد ریاست کو مستحکم بنانا اور خواتین کو آگے بڑھانا تھا۔ ڈاکٹر ناہید ظفر اپنی کتاب ''ہندستانی مسلم خواتین کی علمی خدمات'' (عہد سلطنت تا 1947) میں لکھتی ہیں:

''شاعری کا تعلق زندگی اور عوام سے جوڑنے کے لیے نواب سلطان جہاں نے شعرا کو علمی و ادبی، سماجی، اقتصادی، مذہبی اور قومی مسائل پر نظمیں لکھنے کی تاکید کی چنانچہ شعرا نے مذکورہ موضوعات (محبت، مساوات، برابری اور حصولِ علم) پر شاعری کا آغاز کیا۔ علمی نثر نے بھی اس عہد میں بڑا فروغ پایا۔ بیگم نواب کے ذوق علمی نے ایسی متعدد کتابیں لکھوائیں جو علمی سرمایہ میں بیش بہا اضافے کا سبب بنیں۔ تحریر میں فکری عنصر عام ہوا تنوع مضامین کے ساتھ سادہ و سلیس عبارت کا رجحان عام ہوا۔ نوجوان ادیبوں نے مقالہ نگاری، افسانہ نگاری اور ناول نویسی کی طرف راغب ہو کر قابلِ تعریف نمونے پیش کیے۔ علمی و ادبی رسائل کا اجرا بھی عمل میں آیا ان میں ''الحجاب''، ''ظل السلطان''، ''ندیم''، ''الحبیب''، ''نگار بھوپال'' اور ''محسن الملک'' بالخصوص قابلِ ذکر ہیں۔

بیگم صاحبہ نے خواتین واطفال کے لٹریچر میں بھی قابل قدر اضافہ کیا۔''

دور دراز کے ادیبوں کو دعوت دینا، انعام واعزاز سے نوازنا، طباعت و اشاعت کو فروغ دینا جیسے ان کا بنیادی مقصد بن گیا تھا۔ ڈاکٹر نفیس بانو (سرسید کے فکری زاویے) بیگم صاحبہ کی ادب نوازی پر لکھتے ہوئے اس کا بھی حوالہ دیتی ہیں کہ سیرت النبیؐ فیضِ سلطانی سے ہی منظرِ عام پر آئی۔ شبلی خود اعتراف کرتے ہیں۔

مصارف کی طرف سے مطمئن ہوں میں، بہرصورت
کہ ابرِ فیضِ سلطانِ جہاں بیگم زر افشاں ہے
غرض دو ہاتھ اس کام کے ہیں انجام میں شامل
کہ جس میں اک فقیرِ بے نوا ہے ایک سلطاں ہے

بیگم سلطان جہاں کے اس عزم کو ''حیات سلطانی'' میں بخوبی اجاگر کیا گیا ہے۔ اور مختلف دلائل سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ ان کے یہاں تصنیف وتالیف سے محض یہ مراد نہیں کہ ہر قسم کی رطب ویابس جمع کر کے ایک کتاب مرتب کردی جائے۔ یہ تو ایسا آسان کام ہے جو ایک معمولی استعداد کا آدمی بھی انجام دے سکتا تھا بلکہ تصنیف وتالیف کا اطلاق اسی پر صادق آتا ہے جس میں مصنف کا دماغ صرف ہوا ہو۔ کل مضامین تحقیق وتنقید کے بعد حسنِ قابلیت سے ترتیب دیے گئے ہوں اور کتاب اپنے موضوع کے لحاظ سے امتیازی درجہ رکھتی ہو۔ دانشورانِ ادب نے بیگم صاحبہ کو زمرۂ مصنفین میں جو ممتاز جگہ دی ہے وہ ان ہی خصوصیات کی بنا پر ہے اور یہی امر قابلِ حیرت ہے کہ ملک داری کے اہم ترین فرائض میں کامل مصروفیتوں کے باوجود بھی سلطان جہاں بیگم نے فرائض تصنیف وتالیف میں اسی اعلیٰ قابلیت کا ثبوت دیا جس قابلیت نے حکمرانی کی صنف میں ان کو درجہ امتیاز بخشا۔ اس اعتبار سے کوئی حکمراں مصنف علیا حضرت کے مقابلہ میں نہیں لایا جا سکتا اور بہ لحاظ کثرت تصانیف کسی حکمراں مصنف کا نام تاریخ کی ضخیم جلدیں نہیں پیش کر سکتیں۔ اتنا ہی نہیں، اگر اس سے آگے بڑھ کر محض صنفِ اُناث پر نظر کی جائے تو کسی ملک اور قوم کی تاریخ فرماں روا خواتین میں ایسی صاحبِ تصنیف خاتون کا نام پیش کرنے سے عاجز ہے۔ یہ فخر بھوپال ہی کی تاریخ کو حاصل ہے جس میں مسلسل دو بیگمات صاحبِ تصنیف ہوئی ہیں۔ پہلی نواب شاہ

جہاں بیگم صاحبہ اور دوسری ان کی لائق جانشین نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ لیکن ان دونوں فخر نسواں بیگمات میں ایک بہت بڑا فرق ہے۔ نواب شاہ جہاں بیگم صاحبہ کا تصنیف وتالیف مستقل مشغلہ نہ تھا لیکن سلطان جہاں بیگم کی علمی وسیاسی زندگی مساوی حیثیت رکھتی ہے اور تصنیف وتالیف اُن کے مشاغل کا ایک لازی جزو رہا یہ رسم بھی موصوفہ ہی کی ایجاد ہے کہ ہر سالگرۂ یوم ولادت اور یوم صدر نشینی کے موقع پر حکام وارا کین ریاست اور خواتین کو ایک علمی تحفہ تقسیم فرمایا جاتا جس میں عموماً خود اُن ہی کی ایک دو تصانیف ہوتیں۔ اس طرح ہر سال اردو لٹریچر میں ایک ایک مفید وقابل قدر اضافہ ہو جاتا اور عوام میں کشش ورغبت بھی بڑھتی جاتی۔ بلاشبہ اس وقت بھی ہندستانی خواتین میں بعض بہت اچھی لکھنے والی تھیں اور انھوں نے اپنے مضامین اور تصنیف وتالیف سے ملکی بہنوں کو بہت فائدہ پہنچایا۔ لیکن جس خاتون نے سب سے زیادہ اور خواتین کے لیے مفید وکارآمد لٹریچر کا اردو میں اضافہ کیا وہ نواب سلطان جہاں بیگم ہی کی ذات بابرکت ہے۔

### بیگم سلطان جہاں کا طریقۂ تصنیف وتالیف

اس میں شک نہیں کہ ایک ایسی حکمراں خاتون کے لیے جو فرائض حکمرانی کو کامل مصروفیت وتوجہ کے ساتھ انجام دے تصنیف وتالیف کا کام نہایت مشکل اور بظاہر غیر ممکن ہے لیکن اس خاتون کے لیے کوئی مشکل نہیں جس کو مبداء فیاض سے غیر معمولی دل ودماغ عطا ہوا ہو۔ بقول امین زبیری علیا حضرت قدرت خداوندی کا ایک عجیب وغریب نمونہ تھیں۔

> ''حضور ممدوحہ جس طرح سیاست وحکمرانی کی اعلیٰ قابلیت لے کر پیدا ہوئی تھیں اسی طرح قدرت نے تصنیف وتالیف کا امتیازی وصف بھی عطا فرمایا جس میں کسی کام کا جوہر طبعی ہوتا ہے وہ ظاہر ونمایاں ہوئے بغیر نہیں رہتا اس لیے غیر ممکن تھا کہ علیا حضرت جو بیدار مغزی، علم وفضل اور بصیرت میں شانِ امتیاز رکھتی تھیں اس جوہر سے کام نہ لیتیں۔ اگر چہ دفتر تاریخ سے تصنیف وتالیف میں امداد لی جاتی تھی لیکن اس کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں کہ جو کسی مصنف کے معاون شاگردوں کی ہوتی ہے۔

موضوع خود علیا حضرت متعین فرماتی تھیں اور دفتر تاریخ کا یہ فرض ہوتا کہ وہ مواد جس کا حکم دیا جائے فراہم کرے مثلاً اگر علیا حضرت نے بھوپال کے کسی سابق حکمراں کی سوانح تالیف فرمانی چاہی تو دفتر تاریخ کے ذمہ یہ کام تھا کہ وہ پرانے کاغذات اور اسناد تلاش کر کے اور مسلوں سے واقعات کا اقتباس کر کے علیا حضرت کی روبکاری میں پیش کر دے۔ پھر علیا حضرت اس حصہ کو تحریر فرماتیں جو اصل تصنیف یا تالیف ہوتا ہے اگر کسی کتاب میں انگریزی کتابوں سے اقتباس کی ضرورت ہوتی تو خود علیا حضرت پوری کتاب یا اس کے بعض مقامات متعین فرما دیتیں، ان کا ترجمہ پیش کر دیا جاتا۔ بعض اوقات خود ہی کتاب کا ترجمہ کر لیتیں اور اپنے خیالات قلمبند فرماتی جاتیں''۔

محمد امین زبیری مارہروی محض یہ روداد ہی بیان نہیں کرتے ہیں بلکہ وہ تاثرات بھی قلم بند کرتے ہیں جو ایک ادیب کی حیثیت سے انھوں نے محسوس کیے یعنی جب کتاب کا ابتدائی مسودہ صاف ہو کر پھر اُن کی خدمت میں پیش کیا جاتا تو وہ ملاحظہ فرماتیں اور اس اثنا میں جو نئے خیالات ذہن میں آتے یا کچھ اضافہ مقصود ہوتا وہ مقابل کے کالم پر لکھ دیتیں۔ اکثر ایسا ہوتا کہ نظر ثانی میں کئی کئی کالم بڑھ جاتے:

''یہ بات خاص طور پر قابلِ بیان ہے کہ علیا حضرت جو کچھ تحریر فرماتیں وہ قلم برداشتہ ہوتا اور بہت جلد مسودہ ترمیم فرما کر واپس فرما دیتیں۔ دفتر تاریخ میں عموماً دو ہی تین روز کے بعد مسودہ ترمیم و اضافہ ہو کر واپس آ جاتا۔ یہ اصلاح شدہ مسودہ پھر دوسری مرتبہ صاف ہو کر روبکاری میں بھیجا جاتا علیا حضرت پھر نہایت غور سے ملاحظہ فرماتیں اور جو الفاظ یا جملے نا مناسب یا سُست نظر آتے ان کی اصلاح و درستی فرماتیں۔ حتیٰ کہ کتابت کی جزئی و معمولی غلطیاں بھی نظر سے نہ بچ سکتیں۔ غرض یہ مسودہ آخری مرتبہ صاف ہو کر مطبع بھیج دیا جاتا۔ بعض اوقات مسودہ مکمل ہو

جانے کے بعد اس موضوع میں خاص قابلیت رکھنے والے اصحاب کے پاس بغرض تنقید بھیجا جاتا اور پھر علیا حضرت ان کی آزادانہ تنقید پر غور فرماتیں اگر اعتراض وتنقید قابلِ قبول ہوتی تو اس کے مطابق مسودہ کی اصلاح کر دیتیں ورنہ اپنی رائے پر قائم رہتیں اور اس کو بزور دلائل تسلیم کراتیں۔ ایسے مباحث نہایت پُر لطف ہوتے۔''

(حیات سلطانی، ص، 307)

مہتمم تاریخ، سید محمد امین زبیری کی تحریر سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ بیگم سلطان جہاں کی تصانیف کا عام رؤسا وامرا کی تصانیف سے کس قدر بلند درجہ ہے۔ اُن کی کل تصانیف پر اگر تفصیل سے مدلل گفتگو کی جائے تو صرف اس پر ایک اچھا خاصا تنقیدی مقالہ ہو جائے گا۔ تاہم کچھ اندازہ ان تبصرات سے ہوسکتا ہے جو ملک کے مشہور فضلا اور ناقدین مثلاً مولانا ابوالکلام آزاد، مولوی عبدالماجد دریابادی، مولوی عبدالحق، مولوی عبدالسلام ندوی کے اخبارات ورسائل میں چھپ چکے ہیں۔ اس لیے صرف اجمالی تبصرہ پر اکتفا کیا جاسکتا ہے۔

یوں تو ہندوستان میں کتابیں لکھنے والے بہت ہیں لیکن اپنی کتاب نہایت سلیقہ مندی اور دقیقہ سنجی سے تمام شرائط تصنیف وتالیف ملحوظ رکھ کر مرتب کرنے والے گنتی کے چند ہی مصنف ہیں۔ ان ہی میں سے ایک نواب سلطان جہاں بیگم کا نام نامی بھی ہے۔ اُن کی کل کتابیں تصنیف وتالیف کے مشکل فن میں کمال تجربہ کاری کا بہترین نمونہ ہیں۔ خوبی وصفائی سے خیالات ادا کرنے کی قابلیت بہت کم لوگوں کو حاصل ہوتی ہے۔ محترمہ اس خصوصیت میں بھی ملک کے کسی مشہور مصنف سے کم نہیں ہیں۔ وہ ہر مضمون اور ہر مطلب کو جیسے شستہ اور دل نشین پیرایہ میں ادا فرماتیں، اس کی نظیر ملک کی دیگر مصنف خواتین میں مشکل سے ملے گی۔ تقریباً ہر تصنیف حشو وزوائد سے پاک ہے، اور مفید اور کام کی باتوں پر مشتمل ہے۔ اُن کو علاوہ مذہب کے، حفظانِ صحت میں ماہر فن کا درجہ حاصل تھا اور اس موضوع پر انھوں نے جو کتابیں تصنیف فرمائیں وہ ملک میں بے حد مقبول ہو چکی ہیں۔ پنجاب، بنگال، پونہ اور حیدرآباد دکن کے سررشتہ تعلیم نے تندرستی اور بچوں کی پرورش وغیرہ کتب پر انعام دیا، نصاب میں شامل کیا۔ تعلیم پر انھوں نے اپنے لکچروں میں جن بیش بہا اور

قابل قدر خیالات کا اظہار فرمایا ہے وہ اس پیچیدہ اور نازک مسئلہ پر مکمل ہدایت نامہ ہیں۔فنِ تربیت وتدبیر منزل وہ فن ہے جس پرانھوں نے خاص طور پر توجہ فرمائی اور اپنے سالہا سال کے تجربہ اور غور وفکر کے بعد ایک نہایت مبسوط کتاب چار حصوں میں تصنیف کی۔''ہدیۃ الزوجین'' اور'' حفظانِ صحت'' اس کتاب کے دو ابتدائی اجزا ہیں۔اور دو آخری حصے معیشت و معاشرت کے نام سے موسوم ہیں۔اس موضوع پر اردو میں اس قدر جامع، کثیر المعلومات اور موجودہ ضروریات پر حاوی کوئی کتاب موجود نہیں ہے۔اُن کی تصانیف کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ خشک اور روکھے پھیکے مضامین اس قدر دلچسپ انداز میں لکھے گئے ہیں جس سے زیادہ کسی قادرالکلام مصنف سے ممکن نہیں ہے۔بلا شبہ اُن کو تصنیف و تالیف میں جو مرتبہ حاصل ہے وہ ملک کے کسی مشہور مصنف سے کم نہیں ہے۔اور صنف اناث میں کسی خاتون کو یہ درجہ حاصل نہیں ہے۔ہندوستان کے مشہور خطیب وادیب مولانا ابوالکلام آزاد نے بیگم صاحبہ کے مذاق علمی اور مشغلہ تصنیف وتالیف کے متعلق تاریخی واقعات کے ساتھ نہایت زبردست تبصرہ کیا ہے۔وہ اپنے کالموں میں لکھتے ہیں کہ:

> ''لیکن انقلاب کا یہ کیسا دردانگیز منظر ہے کہ جس قوم نے تلوار کے سائے اور تخت کی خود فراموشیوں میں بھی حیاتِ علمی بسر کی ہو آج اس کے مدارس وجوامع کے صحن اور علم وفن کی مجالس ذوق علمی سے خالی ہوں اور ایوان و دربار سے کیا امید کیجئے کہ خود ہمارے مدرسے اور دارالعلوم ہی مصنف پیدا کرنے سے عاجز ہو گئے۔لیکن الحمدللہ کہ ایک نظیر موجودہ عالم اسلامی میں ایسی موجود ہے جو ریاست وملک رانی کے ساتھ شوق علم اور ذوقِ تصنیف و تالیف کو بھی جمع کرتی ہے اور مزید برآں یہ کہ وہ صنفِ رجال میں سے نہیں ہے جس کو اپنے تقدم کا ہمیشہ غرور بیجا رہا ہے بلکہ اس صنفِ اناث میں سے ہے جس کو دماغی اور ذہنی اشغال سے ہمیشہ معذور سمجھا گیا ہے اور اگر فی الحقیقت ایسی ہی چند مثالیں ہر دور میں ملتی رہیں تو بقول لفضلت النساء علی الرجال یہ وجود گرامی آج نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام عالم اسلامی کے لیے موجب صد افتخار ہے۔حضور عالیہ کی ذاتی قابلیت و

لیاقت قوت تدبیر ونظم ریاست، سیاست دانی وکارفرمائی۔ جوشِ مذہبی و اسلام خواہی، علم پروری اور جودوسخا اعمال خیر یہ وکارہائے حسنہ ایسے اوصاف جلیلہ وعظیمہ ہیں جن میں سے ہر ایک وصف بجائے خود کسی انسان کے شرف و امتیاز کے لیے بہترین وظیفہ ہوسکتا ہے ان سب پہ مستزاد یہ کہ وہ بحیثیت ایک مصنفہ اور اہلِ قلم کے بھی جلوہ افروز ہیں اور مسلسل متعدد ومفید کتابیں ان کی تالیفات میں سے چھپ کر شائع ہو چکی ہیں۔ ہر کام کی قیمت اس کے عوارض اور اضافی حالات کی نسبت سے قرار دی جاتی ہے۔ اگر ایک فقیہہ علم مدرسہ وخانقاہ کے حجرہ میں بیٹھ کر دنیا کے تمام تفکرات وترددات سے قطع تعلق کر کے تصنیف وتالیف میں مصروف ہے تو اس کے اشغال علمیہ کے نتائج جس قدر اعلیٰ واکمل ہوں، ہونے ہی چاہئیں وَ لِکُلِّ فَنٍّ رِجَالٌ لیکن ایک فرماں روائے ریاست لاکھوں مخلوقات الٰہی کی نگرانی وخدمت گزاری اور ایک پورے خطہ ارضی کے نظم وارادہ کے ساتھ اگر ایک صفحہ بھی تالیف کر کے پیش کردے تو ہزاروں درجہ اس سے کہیں زیادہ موجب استحسان وشرف واحترام ہے۔ حق یہ ہے کہ حق سبحانہ تعالیٰ کی یہ ایک بہت بڑی بخشش وتوفیق ہے جو فرماں روائے بھوپال کو مرحمت ہوئی ہے۔ دولت وقوت کو اگر ایک امانتِ الٰہی کی خدمت اور مرضات الٰہیہ کی راہ میں خرچ کیا جائے اور جس خوش طالع کو امارت و ریاست کے ساتھ اس کے استعمال صمیم کی بھی قابلیت عطا ہو اس سے بڑھ کر اس آسمان کے نیچے کوئی خوش بخت نہیں شب زندہ دار صائم الدہر اور دائم نوافل گزار ہوں مجاہدین فی سبیل اللہ جو اپنے نفوس کو حفظ کلمۂ حق و صداقت کی راہ میں قربان کریں، علمائے شریعت وصوفیائے طریقت جو اپنی خدماتِ علم وتفقہ اور ارشادات وہدایات سے خلق اللہ کو سعادت اندوز فرمائیں۔ یہ سب کے سب بھی ان مدارجِ عالیہ اور فضائلِ الٰہیہ

سے محروم ہیں۔

پس اصل یہ ہے کہ اگر حق تعالیٰ نے سرکار عالیہ کو خدمت ملک وملت کی توفیق مرحمت فرمائی ہے تو اس کے لیے قوم کو جتنا ان کا شکر گزار ہونا چاہیے اس سے کہیں زیادہ ان کو اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہونا چاہیے۔'' (حیات سلطانی، ص، 311-310)

مہتمم تاریخ محمد امین زبیری مارہروی مختلف حوالوں سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ:

''یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ ہر اہلِ قلم اور ہر مصنف ومولف کسی خاص مقصد کو پیش نظر رکھ کر اور کسی خاص جذبہ سے متاثر ہو کر تصنیف و تالیف کے لیے آمادہ ہوتا ہے، محنت کرتا، اور قلم اٹھاتا ہے۔ اسی فطری قاعدہ کے مطابق سرکار عالیہ کے مشغلۂ تصنیف و تالیف میں للّٰہیت اور خالص قومی و مذہبی اور انسانی ہمدردی کا مقصد و جذبہ کارفرما تھا۔ وہ اس کو رفاہِ عام اور اجر وثواب کا کام سمجھ کر محنت سے کرتی تھیں۔ اور ہر پل خواتین کی فلاح و بہبود کے تعلق سے سوچتی رہتی تھیں۔''

آج عورت زندگی کے ہر میدان میں آگے آکر نئی دنیا کی تعمیر میں اپنا کردار ادا کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ تاہم اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ابھی کتنے ہی شعبہ ہائے حیات ایسے ہیں جن میں عورت کو اپنی فطری صلاحیتوں کے اظہار کے مناسب مواقع نہیں مل رہے ہیں، بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ عہدِ حاضر میں عورتوں کی صلاحیتوں کی نشوونما کی بھرپور، سنجیدہ اور منصوبہ بند کوشش ہی نہیں ہو رہی ہے اور جب صلاحیتوں کے بیدار ہونے اور پروان چڑھنے کے بھرپور مواقع میں نیک نیتی نہ ہو تو ان کے باقاعدہ فروغ پر سوالیہ نشان اُبھرنا لازمی ہے۔

ادب انسانی زندگی کی داخلی اور خارجی حقیقتوں کو لفظوں کی شکل دینے کا ایک وسیلہ ہے۔ اگر ہم اپنے ادبی سرمایہ پر نظر ڈالیں تو یہ صاف ظاہر ہے کہ ادب کی مختلف اصناف میں خواتین نے بھی طبع آزمائی کی ہے۔ چاہے وہ افسانوی ادب ہو یا شاعری یا پھر دوسری اصناف۔ اس ضمن میں نذر سجاد حیدر، حجاب امتیاز علی، رشید جہاں، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، ممتاز

شیریں، جیلانی بانو، فہمیدہ ریاض، پروین شاکر، کشور ناہید، زاہدہ حنا، سارہ شگفتہ، شفیق فاطمہ شعریٰ، ترنم ریاض کے نام اہم ہیں۔ ان قلم کاروں نے اپنی تخلیقات میں عورت کی حالت وحیثیت کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ 1990 کے بعد کے اردو ادب میں کچھ خواتین نے مختلف اصناف سخن میں ناموری حاصل کی لیکن یہ کہنا شائد غلط نہ ہو کہ اکثر خواتین فن کاروں نے باوجود صلاحیت کے جم کر ابھی نہیں لکھا ہے۔

دنیا کے ہر ادب کا اپنے سماج اور معاشرے سے گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ ہمارے ادب میں یہ روایت زبان وادب کے آغاز سے آج تک مسلسل جاری ہے۔ ہر عہد کی طرح آج کا عہد بھی نئی نسل سے نئے شعور اور بصیرت کا تقاضہ کرتا ہے۔ لہٰذا آج کی اردو جاننے والی خواتین کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ادب کے ساتھ ساتھ صحافت، تاریخ، معاشیات اور سماجیات جیسے موضوعات پر بھی لکھیں۔ ان کے اس عمل سے زبان کو بھی تقویت ملے گی اور دوسری زبانوں کی طرح اردو میں بھی خواتین تخلیقی ادب کے علاوہ ان موضوعات پر بھی توجہ دیں گی جن پر لکھے بغیر اردو میں خواتین کے نقطۂ نگاہ کی نمائندگی نہیں ہوسکتی۔

یہ تو اپنے آپ میں غور وفکر کا اہم موضوع ہے کہ اہلِ قلم کی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ادب پرور سنجیدہ حلقوں کے لیے یہ کام منصوبہ بندی کا بھی ہے کہ وہ خواتین اور طالبات کی نئی نسل کی ادبی تربیت کس طرح کریں کہ ادب کے میدان میں سنجیدہ اور باوقار خواتین قلم کاروں کی مسلسل صفیں موجود رہیں۔

ادب میں خواتین کی حصہ داری کے فروغ کے لیے پورے ملک میں طالبات کی درس گاہوں، اسکولوں اور اعلیٰ تعلیم کے اداروں میں لڑکیوں کی تعلیمی صلاحیتوں کے فروغ کی جدوجہد کے ساتھ ان کی ادبی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کی کوشش، اچھی خواتین قلم کار پیدا کرنے کا اولین زینہ ثابت ہوسکتی ہے۔

اردو کے اخبارات ورسائل کے صفحات میں ادبی صفحات اور گوشے عام طور پر شائع ہوتے ہیں لیکن کبھی کبھی یہ صفحات اور گوشے خواتین اور طالبات کی تحریروں کے لیے مخصوص کیے جائیں تو یہ ان کی حوصلہ افزائی کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔

اہم اداروں اور ادبی تنظیموں کی جانب سے خواتین قلم کاروں کے لیے ادبی مقابلے اور ادب نواز شخصیات اور حلقوں کی جانب سے انعامات کے سلسلے بھی ان کے شوق اور صلاحیتوں کے جلا کا وسیلہ بن سکتے ہیں۔ ادبی نقادوں کو بھی تانیثی ادب پر زیادہ توجہ کرنا چاہیے۔

ملک بھر کی اردو اکادمیاں خواتین قلم کاروں کی تخلیقات کی اشاعت کے لیے اپنے بجٹ کا کچھ حصہ مختص کریں تو یہ اقدام بھی ان کے تخلیقی ذوق کو مہمیز دینے کا سبب بنے گا۔

''سال کی بہترین خاتون قلم کار انعام'' کا سلسلہ بھی خواتین کی ادب میں حصہ داری کی آواز کو وقار عطا کر سکتا ہے اور یہ تمام کوششیں ظاہر ہے کہ اردو زبان کے فروغ میں بھی اہم کردار ادا کر سکتی ہیں۔

فکشن اور شاعری کے علاوہ صحافت، معاشیات، سماجیات اور تاریخ کے موضوعات پر بھی اردو میں خواتین قلم کاروں کی تعداد بہت کم ہے۔ اس ضمن میں کاوش کی بڑی ضرورت ہے۔ کوئی بھی زبان محض اپنے تخلیقی ادب کے بل پر معاشرہ میں اہم تبدیلیاں لانے کا وسیلہ نہیں بن سکتی۔ ادب کی پہنچ اہل علم اور اہلِ ذوق کے ایک محدود حلقہ تک ہوتی ہے یا پھر وہ تفریح کا ذریعہ بن کر رہ جاتا ہے۔ ہمیں اردو تحریروں کے موضوعات کا دائرہ بڑھانا ہوگا۔ اگر خواتین ہی اپنے مسائل پر آسان اور عام فہم زبان میں مضامین شائع نہیں کروائیں گی تو ان کے شعور اور ادراک کی نمائندگی اردو میں کیوں کر ہوگی۔ بصورتِ دیگر انھیں اپنی نمائندگی کے لیے بھی مرد قلم کاروں کا دست نگر رہنا ہوگا۔ اب یہ فیصلہ خواتین کے ہاتھ ہے کہ وہ اپنی ترجمانی آپ کرتی ہیں یا نہیں۔

## تصانیف بیگم سلطان جہاں کا تفصیلی تعارف

| نام کتاب | موضوع | اشاعت | صفحات | پبلشر |
|---|---|---|---|---|
| 1۔ تزکِ سلطانی | تاریخ | 1910 | 424 | مطبع سلطانی، ریاستِ بھوپال |
| 2۔ گوہرِ اقبال | ایضاً | 1913 | 353 | ایضاً |

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| 3۔ ہدایاتِ سلطانی | ایضاً | 1913 | 206 | ایضاً |
| 4۔ خطباتِ سلطانی | مجموعۂ تقاریر | 1913 | 329 | ایضاً |
| 5۔ ڈومیسٹک اکونومی | معاشیات | 1913 | 160 | مطبع مفیدِ عام، آگرہ |
| 6۔ اخترِ اقبال | تاریخ | 1914 | 254 | ایضاً |
| 7۔ حیاتِ شاہجہانی | سوانح | 1914 | 163 | ایضاً |
| 8۔ تذکرۂ باقی | ایضاً | 1915 | 92 | مطبع سلطانی، ریاستِ بھوپال۔ |
| 9۔ ہدیۃ الزوجین اول | ازدواجی زندگی | 1915 | 81 | ایضاً |
| 10۔ تندرستی | صحتِ عامہ | 1916 | 120 | ایضاً |
| 11۔ حفظانِ صحت | ایضاً | 1916 | 139 | ایضاً |
| 12۔ معیشتِ خانہ داری | امورِ خانہ داری | 1916 | 256 | ایضاً |
| 13۔ معاشرت کا ذکرِ مبارک | تہذیب وتربیت | 1916 | 291 | ایضاً طبع ثانی، ایجوکیشنل کانفرنس |
| 14۔ نِٹنگ (فنِ بُنائی) | تربیتِ خواتین | 1916 | 80 | مطبع سلطانی، ریاستِ بھوپال |
| 15۔ حیاتِ قدسی | سوانح | 1917 | 234 | ایضاً |
| 16۔ سبیل الجنان | مجموعۂ تقاریر | 1917 | 460 | ایضاً |
| 17۔ روضۃ الریاحین (دوسرا ایڈیشن) | سفرنامۂ حج | 1917 | 247 | ایضاً |
| 18۔ عفت المسلمات | تربیتِ خواتین | 1918 | 206 | مفیدِ عام اسٹیم پریس، آگرہ۔ |
| 19۔ سلکِ شہوار | مجموعۂ تقاریر | 1919 | 188 | مطبع علی گڑھ کالج |

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| 20۔ مقصدِ ازدواج | ازدواجی زندگی | 1920 | 124 | مطبع سلطانی |
| 21۔ سیرتِ مصطفیٰ | دینیات | 1920 | 158 | ایضاً |
| 22۔ بچوں کی پرورش | تربیتِ خواتین | 1921 | 305 | مفیدِ عام، آگرہ |
| 23۔ فرائض النساء | ایضاً | 1921 | 229 | مطبع سلطانی |
| 24۔ رہبرِ نسواں | ایضاً | 1922 | 362 | ایضاً |
| 25۔ اسلامیات | دینیات | 1922 | 160 | ایضاً |
| 26۔ ہدایاتِ باغبانی | فنون | 1923 | 117 | ایضاً |
| 27۔ اخلاق کی پہلی کتاب | تہذیب و تربیت | 1924 | 140 | شمسی پریس، آگرہ |
| 28۔ اخلاق کی دوسری کتاب | ایضاً | 1925 | 140 | ایضاً |
| 29۔ باغِ عجیب (دو حصے) | ادب و ثقافت | 1926 | 160 | شمسی پریس، آگرہ |
| 30۔ اخلاق کی تیسری و چوتھی کتاب | تہذیب و تربیت | 1926 | 166 | ایضاً |
| 31۔ تربیت الاطفال | بچوں کی نگہداشت | 1928 | 120 | مطبع شمسی مشین پریس، آگرہ |
| 32۔ ہدیۃ الزوجین دوم | ازدواجی زندگی | 1928 | 120 | ایضاً |
| 33۔ حیاتِ سکندری | سوانح | 1930 | 250 | ایضاً |
| 34۔ فلسفۂ اخلاق | اخلاقیات | 1931 | 120 | مطبع سلطانی |
| 35۔ توقعات و اوامر | تہذیب و تربیت | 1931 | 140 | ایضاً |
| 36۔ مطبخ کنگ جارج | فنون | 1931 | 160 | شمسی پریس، آگرہ |
| 37۔ ہدایاتِ تیمارداری | تہذیب و تربیت | 1931 | 140 | ایضاً |
| 38۔ سیاحتِ سلطانی | سیر و تفریح | - | 160 | درج نہیں ہے |

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| 39۔ افضال رحمانی | ادب | - | 160 | ایضاً |
| 40۔ مدارج القرآن | دینیات | - | 120 | ایضاً |
| 41۔ آئینِ سکندری (ترجمہ ومقدمہ) | تاریخ | - | 180 | حمیدیہ آرٹ پریس، بھوپال |
| 42۔ تہذیبِ نسواں | تربیتِ خواتین | - | 160 | مطبع مفید عام، آگرہ |
| 43۔ پردہ | ایضاً | - | 120 | ایضاً |

موضوعات کے اعتبار سے یہ ترتیب حسب ذیل ہے:

| | | |
|---|---|---|
| 1۔ دینیات | 3 کتابیں | 1۔ سیرت مصطفیٰ |
| | | 2۔ اسلامیات |
| | | 3۔ مدارج القرآن |
| 2۔ تاریخ | 6 کتابیں | 1۔ تزک سلطانی |
| | | 2۔ گوہر اقبال |
| | | 3۔ اختر اقبال |
| | | 4۔ آئینِ سکندری |
| | | 5۔ ضیاء الاقبال |
| | | 6۔ ہدایات سلطانی |
| 3۔ خطبات | 3 کتابیں | 1۔ خطبات سلطانی |
| | | 2۔ سبیل الجنان |
| | | 3۔ سلک شہوار |
| 4۔ سوانح | 4 کتابیں | 1۔ حیات شاہجہانی |
| | | 2۔ تذکرہ باقی |
| | | 3۔ حیات قدسی |

| | | |
|---|---|---|
| | | 4۔ حیات سکندری |
| 5۔ فنون | 2 کتابیں | 1۔ حیات باغبانی |
| | | 2۔ مطبخ کنگ جارج |
| 6۔ ادب وثقافت | 3 کتابیں | 1۔ توقعات واوامر |
| | | 2۔ باغ عجیب (دوحصے) |
| | | 3۔ افضال رحمانی |
| 7۔ اخلاقیات | 3 کتابیں | 1۔ اخلاق کی پہلی کتاب |
| | | 2۔ اخلاق کی دوسری کتاب |
| | | 3۔ اخلاق کی تیسری وچوتھی کتاب |
| 8۔ تہذیب وتربیت | 3 کتابیں | 1۔ معاشرت کا ذکر مبارک |
| | | 2۔ ہدایات تیمارداری |
| | | 3۔ تہذیب نسواں |
| 9۔ معاشیات | 1 | ڈومیسٹک اکونومی |
| 10۔ سفرنامہ (حج) | 1 | روضۃ الریاحین |
| 11۔ سیاحت | 1 | سیاحت سلطانی |
| 12۔ ازدواجی زندگی | 2 کتابیں | 1۔ ہدیۃ الزوجین |
| | | 2۔ مقصدِ ازدواج |
| 13۔ امورخانہ داری | 1 | معیشت خانہ داری (جزواول) |
| 14۔ صحت عامہ | 2 کتابیں | 1۔ تندرستی |
| | | 2۔ حفظانِ صحت |
| 15۔ تربیتِ خواتین | 6 کتابیں | 1۔ نرسنگ |
| | | 2۔ عفت المسلمات |

3۔ بچوں کی پرورش
4۔ فرائض النساء
5۔ رہبرِ نسواں
6۔ پردہ

16۔ بچوں کی نگہداشت 1 تربیت الاطفال

مذہب سے متعلق ان کی تین کتابیں ہیں۔ سیرت مصطفیٰ ماہ ربیع الاول کے موقع پر خواتین کو مخاطب کرتے ہوئے حیات طیبہ پر کی گئی تقاریر کا مجموعہ ہے۔ اس میں نبوت سے پہلے اور بعد کے معاشرے کو موضوع بناتے ہوئے انسانی فلاح و بہبود کے نظریے کو اُجاگر کیا گیا ہے اور اس پر خاص زور دیا گیا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سب کے لیے رحمت بن کر آئے مگر خواتین کی عظمت سب پر ظاہر کر گئے۔ سلطان جہاں بیگم اس موضوع کے تعلق سے کتاب کے دیباچہ میں لکھتی ہیں:

> ''میرا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ اس میں جس قدر حالات لکھے گئے ہیں وہ انتہائی تحقیق و تنقید کے بعد لکھے گئے ہیں لیکن جہاں تک ہو سکا ہے صحیح روایات کا لحاظ رکھا ہے، اور زیادہ تر وہ نتائج نکالے گئے ہیں جو خواتین کے لیے مفید ہیں۔ آج تک جس قدر حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح عمریاں لکھی گئی ہیں ان میں کوئی سوانح عمری ایسی نہیں ہے جو مخصوص خواتین کے لیے مفید ہو۔ اس ضرورت کو ملحوظ رکھ کر میں نے یہ لیکچر مرتب کیے ہیں اور ایک حد تک وہ حالات وواقعات تلاش کر کے جمع کر دیے ہیں جن کا خواتین کو جاننا ضروری ہے۔'' (ص،5)

مذہبی نقطۂ نظر سے خاتون کو مضبوط بنانے میں ''اسلامیات'' اور ''مدارج القرآن'' بھی تقویت پہنچاتے ہیں۔ ان کا ماننا تھا کہ عورت اگر مذہب کے دامن کو مضبوطی سے تھامے ہوگی تو وہ تمام دنیاوی معاملات میں کامیاب رہے گی اور ایک صحت مند معاشرے کو فروغ دے گی۔ وہ صرف مذہبی کتابوں میں ہی نہیں بلکہ عموماً سبھی کتابوں کی شروعات موضوع سے مطابقت رکھتی

ہوئی قرآنی آیت سے کرتیں اور مقدمہ یا دیباچہ میں اس کے مفہوم کو بھی واضح کرتیں۔

تاریخ پر ان کی پانچ کتابیں ہیں۔''تزک سلطانی'' میں تہذیب وثقافت اور صنعت وحرفت کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ دراصل یہ کتاب 'تزک بابری' کی طرز پر روزنامچہ کے انداز میں لکھی گئی ہے۔اس میں ان کے ولی عہدی کا دور یعنی 1872 سے 1901 تک کے حالات و واقعات نہایت دلچسپ انداز میں درج کیے گئے ہیں۔حمد ونعت سے شروع ہونے والی اس کتاب کی اہمیت کو وہ اپنے مقدمہ میں اس طرح واضح کرتی ہیں:

> ''اگر چہ اِس تاریخ میں صرف بھوپال کے روز مرّہ کے واقعات اور ریاست کے مفصل حالات ہی درج ہوں گے لیکن ان ہی روزمرہ کے واقعات اور حالات سے نہایت اہم تاریخی نتائج اخذ کیے جائیں گے اور اہلِ بھوپال کے لیے قومی وملکی تاریخ ہوگی اور بالخصوص میرے آئندہ جانشینوں کے لیے۔جبکہ وہ تمام کاغذات و امثلہ جن میں یہ واقعات درج ہیں دفترِ پارینہ ہوکر برباد ہو جائیں گے اور وہ لوگ اُٹھ جائیں گے جنھوں نے ان حالات کا مشاہدہ کیا ہے اور یہ اوراق ان کے متقدمین کی عزت و مساعی کی ایک دستاویز ہوں گے۔'' (ص،4)

اس میں نواب سکندر بیگم کی اصلاحات،نواب باقی محمد خاں کے حالات، والدہ محترمہ کا نکاح ثانی،نواب صدیق حسن خاں سے اختلاف اور ماں سے روٹھنے کا سبب بھی ظاہر ہوتا ہے۔ڈاکٹر رضیہ حامد اپنے گراں قدر تحقیقی مقالہ ''نواب سلطان جہاں بیگم'' میں لکھتی ہیں:

> ''نواب سلطان جہاں بیگم اور ان کی والدہ نواب شاہجہاں بیگم کی ملاقات کامل 27 سال تک نہیں ہوئی۔ان المناک اور افسوس ناک واقعات کا بیان کرتے ہوئے سلطان جہاں بیگم نے تاریخی سلسلہ کو برقرار رکھا ہے۔ اس وجہ سے 'تزک سلطانی' کی حیثیت مکمل تاریخی نہ ہوکر سوانحی ہوگئی ہے جس کو ہم ان کی خودنوشت کا ایک حصہ کہہ سکتے ہیں۔'' (ص،202)

''گوہراقبال'' میں 1901 سے 1908 تک کے حالات اور''اختر اقبال'' میں 1909 سے 1913 تک کے واقعات منظر عام پر آتے ہیں۔''ضیاء الاقبال'' اس کی آخری کڑی قرار دی جا سکتی ہے۔اس میں اگر ہم'' آئین سکندری'' کو بھی شامل کرلیں تو ہر زاویے اور ہر پہلو سے والیان بھوپال کی منضبط تاریخ قاری کے سامنے ہوتی ہے۔

خطبات کے دائرے میں نواب سلطان جہاں بیگم کی تین کتابیں آتی ہیں۔''خطبات سلطانی'' میں نواب سلطان جہاں بیگم کے صدرنشینی سے لے کر 1913 تک کے مختلف خطبات کو ان کے حکم سے نواب محمد حمید اللہ خاں نے شائع کروایا بلکہ ایک مختصر دیباچہ بھی تحریر کیا:

> ''یہ مجموعہ حضور ممدوحہ کی اعلیٰ قابلیت،عزم واستقلال، بیدار مغزی، تدبیر مملکت، ہمدردیٔ قوم وملک کا آئینہ ہے اور میرے علم میں ایک فرماں روا خاتون کے ارشادات عالی کا یہ پہلا مجموعہ ہے جو شائع ہوتا ہے۔میں نہیں کہہ سکتا کہ باعتبار لٹریچر کے ان کی تقریروں اور مضمونوں کا کیا مرتبہ ہے لیکن ان خیالات والفاظ میں قلوب پر اثر ڈالنے اور مفید نتائج پیدا کرنے کی ایک خاص قدرت پائی جاتی ہے۔''(ص،1)

''سبیل الجنان'' بیگم صاحب کی مذہبی تقاریر کا مجموعہ ہے اس میں خواتین کو مخاطب کرتے ہوئے دین ودنیا کو مرکز ومحور بنایا گیا ہے۔وہ اس کی تمہید میں لکھتی ہیں:

> ''خواتین اسلام کو زمانہ حال کی تعلیم اور بہترین تمدن و معاشرت سے بہریاب دیکھنے کا یقیناً مجھ سے زیادہ کوئی شخص آرزومند نہ ہوگا، اور اس مقصد کے لیے میں اپنی ہر امکانی کوشش خواہ اس میں مجھ کو تکلیف بھی برداشت کرنی پڑے،عمل میں لاتی ہوں۔لیکن اس مقصد سے ایک اور بھی اعلیٰ مقصد میرے پیش نظر ہے اور وہ یہ کہ ان میں مذہبی روح، مذہبی پابندی اور مذہبی حمیت بھی بدرجہ اولیٰ ہو کیونکہ تمام شائستہ اور اعلیٰ اوصاف کی بنیاد مذہب کی ہی زمین پر قائم ہوتی ہے اور مذہب ہی نجاتِ اُخروی کا باعث ہے۔''(ص،4)

''سلک شہوار'' خواتین کی تعلیم وتربیت سے متعلق تقاریر کا مجموعہ ہے جو سلطانیہ اسکول، کنیا پاٹھ شالا، مسلم گرلس اسکول، محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس وغیرہ میں دی گئیں۔

سوانح پر چار مکمل کتابیں ہیں۔ ''حیات شاہجہانی'' والدہ محترمہ کی سوانح عمری ہے۔ سات ابواب پر مشتمل اس کتاب میں محض تعلیم وتربیت کا ولی عہدی اور حکمرانی کا ذکر نہیں ہے بلکہ وہ شاہجہاں ثانی کیوں کہلائیں، اس کے بھی مدلل جواز مہیا کیے گئے ہیں۔ سرائے سکندری، کاٹن مل، موتیا تالاب، شاہجہانی مسجد، تاج المساجد کی تعمیر کا تفصیلی ذکر ہے۔ اوران کے شعری مجموعہ'' تاج الکلام'' اور'' دیوان شیریں'' پر بھی کھل کر گفتگو کی ہے۔

''تذکرہ باقی'' میں اپنے والد نواب باقی محمد خاں کے شب و روز، ذاتی اوصاف، عادات و اطوار اور نجی زندگی کو دلکش انداز میں رقم کیا ہے۔ دیباچہ میں اس کا بھی اعتراف کیا ہے کہ مکمل مواد نہ ملنے کی بنا پر کتاب کو حتمی شکل نہ دی جا سکی جس کا تصور انھوں نے بنا رکھا تھا:

> ''جو تھوڑی سی مثلیں اور کاغذات اتلاف سے بچ رہے تھے انہیں سے حالات اور واقعات اخذ کر کے اور کچھ حالات زبانی روایتوں سے حاصل کر کے بعد تحقیق وتنقید ایک جگہ جمع کر دیے گئے ہیں۔ مجھ کو اس کے نامکمل رہ جانے کا بے حد افسوس ہے۔''

''حیات قدسی'' تین ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں نہ صرف ان کی ابتدائی زندگی کے حالات ہیں بلکہ اس نفسیاتی نکتہ پر بھی زور دیا گیا ہے کہ امرا، رؤسا اور اعلیٰ عہدے داران پہلی بار بھوپال میں ایک عورت کو حکمراں کی حیثیت سے تسلیم کرتے ہیں اور پھر اس پر ناز بھی۔

دوسرا حصہ ریاست کے نظم ونسق کے تعلق سے ہے جسے قدسیہ بیگم نے بخوبی انجام دیا۔ تیسرے حصے میں ذاتی زندگی، عادات واطوار، صفات وکمالات قلم بند کیے گئے ہیں۔

''حیات سکندری'' نواب سکندر بیگم کی سوانح عمری ہے۔ تربیت کے لیے نواب سلطان جہاں بیگم نے اپنے بیٹے میجر جنرل محمد عبیداللہ خاں سے مرتب کرنے کو کہا تھا۔ وہ اس کام کو خوبی سے انجام دے رہے تھے کہ انتقال ہو گیا۔ بیگم صاحبہ نے بڑی محبت اور دلجمعی سے اسے شائع کرایا اور تمہیدی کلمات میں جذبات سے پرے ہو کر نواب سکندر بیگم کی مکمل شخصیت کو صفحۂ قرطاس پر اُتار دیا۔

فنون پر اُن کی دو بہت اہم کتابیں ہیں۔ پہلی ''ہدایات باغبانی'' جس میں نباتات کے فوائد بتاتے ہوئے ان کی دیکھ بھال کے طریقے سکھائے گئے ہیں۔ دورِ قدیم سے ہمارے یہاں موسم، فضا اور علاقے کی نسبت سے باغات پر توجہ دی جاتی تھی لیکن انگریزی عمل داری میں جدید سائنسی آلات کے توسط سے باغبانی کو بہتر بنانے کے جتن کیے گئے۔ کتاب کو اسی اعتبار سے دس ابواب میں منقسم کیا گیا ہے مثلاً نارنگی، لیموں، چکوترہ کے لیے کون سی زمین مناسب ہے۔ کب اس کی کاشت کی جائے؟ اور کن باتوں پر خصوصی توجہ دی جائے۔ اسی طرح انار، کیلے، انگور، بیر، آم، شفتالو، کشمش، لوکاٹ اور ناریل کی کاشت کے لیے کن باتوں کو ملحوظ رکھنا چاہیے تاکہ فصل بہتر ہو اور مالی اعتبار سے خوشحالی کا سبب بنے۔

فنون کے اعتبار سے ''مطبخ کنگ جارج'' بھی ان کی اہم کتاب ہے۔ عام معلومات، سائنسی ایجادات اور طرح طرح کے پکوان سے متعلق یہ کتاب خواتین کو بے حد عزیز رہی ہے۔ اچھا کھانا صحت کے لیے کتنا مفید ہے، اس پر بحث کرتے ہوئے نظامِ ہضم کے بارے میں دلائل سے بتایا ہے اور یہ بھی اُجاگر کیا ہے کہ بچے ہوئے کھانے سے کس طرح لذیذ ڈشز تیار کی جاسکتی ہیں جس سے ذائقہ ہی نہیں بدلتا ہے بلکہ مالی فائدہ کا سبب بھی ہوسکتا ہے۔ اس میں انھوں نے مشرق کے مرغوب کھانوں کے ساتھ مغرب کے جدید کھانوں اور ان کے بنانے کی ترکیب سے بھی واقف کرایا ہے۔

ادب وثقافت کے اجزا تو ان کی تمام تصنیفات میں مل جاتے ہیں مگر خاص طور سے تین کتابیں بہت اہم ہیں۔ ''توقعات واوامر'' میں انھوں نے نہایت فلسفیانہ انداز میں انسانی فکر، عمل اور ردِّعمل کو اُجاگر کیا ہے۔ ہر شخص سے کچھ اُمیدیں وابستہ ہوتی ہیں۔ توقعات پر وہ کیسا اُترتا ہے، اس کے دونوں پہلوؤں کو وہ احاطۂ تحریر میں لیتی ہیں اور اکثر جگہ وضاحت کے لیے اشعار یا اقوال کو پیش کرتی ہیں۔

''باغِ عجیب'' کے دونوں حصے سادہ اور عام فہم لہجے میں ہیں۔ مرکزی کردار صالحہ اور امتیاز کے ہیں جو دوسرے بچوں کے ساتھ باغ کی سیر کو جاتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے قصوں کے انداز میں بچوں کی اخلاقی تعلیم وتربیت موثر انداز میں نظر آتی ہے۔ جدت یہ ہے کہ تمام نصیحت آمیز

کہانیاں درختوں، اور پھولوں کی زبانی تمثیلی پیرائے میں بیان کی گئی ہیں۔

''افضال رحمانی'' بھی بچوں کے لیے بچوں کے انداز میں لکھا گیا مختصر سا کتابچہ ہے۔ جس میں حدیث اور قرآن کے توسط سے انسانیت، محبت اور مساوات کا درس دیا گیا ہے، پاک صاف رہنے کی ہدایت کی گئی ہے۔

درسِ اخلاق پر ان کی دو کتابیں دستیاب ہیں جن کے چار حصے ہیں۔ اخلاق کی پہلی کتاب میں گھر کو جنت بنانے کے آداب سکھائے گئے ہیں۔ عورتوں اور بچوں کے عادات واطوار اور اخلاق پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ دوسرے حصے میں وہ اشعار کا بھی برمحل استعمال کرتی ہیں۔ زیادہ تر اشعار منشی محمد یوسف قیصر کے ہیں جو حکومت کی جانب سے بچوں کے لیے نصابی نظمیں تیار کرتے تھے۔ بیگم صاحبہ نے اس کا اعتراف مقدمہ کے آخر میں ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''میں نے اپنے اوقات فرصت میں اس کتاب کے مسودہ پر بہت کچھ محنت کی ہے اور انگریزی کتابوں سے اس میں مدد لی ہے لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتی کہ میرے دفتر تاریخ نے مسودوں کی صفائی اور حوالہ جاتی وغیرہ کی تلاش میں مجھے حسب معمول بہت مدد دی ہے۔'' (ص،6)

اخلاق کی دوسری کتاب کا تیسرا اور چوتھا حصہ مذکورہ خوبیوں پر مبنی ہے البتہ اس میں نظمیں زیادہ استعمال کی گئی ہیں۔ تاریخ بھوپال کے ماہر اور محقق محمد امین زبیری، حیات سلطانی کے صفحہ نمبر 292 پر لکھتے ہیں:

> ''بچوں کے لیے لکھی گئی نظموں نے اس کتاب کو اور بھی زینت دی ہے۔ یہ اس قابل ہیں کہ بچوں کو زبانی یاد کرائی جائیں تاکہ بچوں کو خوش الحانی کے ساتھ موزوں پڑھنے کی مشق ہو اور ان کا اثر دل پر ہو جائے۔''

کتاب کے عنوانات مثلاً کام، کوشش، فرض، تکمیل، انسانی مساوات، حُبّ الوطن، کفایت شعاری، نیک مزاجی، محبت، خود اعتمادی، ہمت وغیرہ بچوں سے انسیت اور ان کے روشن مستقبل کی فکر کے غماز ہیں۔ ڈاکٹر رضیہ حامد مذکورہ کتاب کی اہمیت اور افادیت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> ''ان میں آسان زبان اور سادہ طریقے سے بچوں کے اخلاق وعادات کو
> سنوارنے، ان کی معلومات میں اضافہ کرنے کے لیے چھوٹے چھوٹے
> مضمون لکھے گئے ہیں۔''(ص،226)

تہذیب وتربیت پر نواب سلطان جہاں بیگم نے تین کتابیں قلم بند کی ہیں۔اُن کا کہنا ہے کہ تہذیب وتمدن کا یہ ایک عام مسئلہ ہے کہ جس قدر انسان کے خانگی معاملات میں خرابی اور ابتری پیدا ہوگی اُسی قدر اُس کے بیرونی مشاغل میں فتور بڑھتا جائے گا۔گھر کی بدانتظامی کا اثر نہ صرف کنبہ پر بلکہ ملکی اور قومی فرائض پر بھی پڑے گا۔لہٰذا اس جانب توجہ ضروری ہے۔ان کا یہ بھی ماننا ہے کہ دنیا کی ترقی یافتہ قوموں کا راز ان کے گھروں کے باقاعدہ انتظام ہی میں مضمر ہے۔''معاشرت کا ذکر مبارک''اسی موضوع پر محیط ہے۔''ہدایات تیمارداری''میں انھوں نے طبی اصولوں کے پیش نظر عیادت کے طریقے سمجھائے ہیں اور صفائی پر خصوصی توجہ دی ہے۔''تہذیب نسواں''اُن کا خاص موضوع ہے۔مذکورہ نکات کو یکجا کرتے ہوئے وہ خواتین کو آگاہ کرتی ہیں کہ گھر کی راحت اور مسرت کا انحصار ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر ہے۔یہ نہ صرف خوش انتظامی اور حسن معاشرت پر دال ہے بلکہ قومی اور ملکی بہبود کا دارومدار بھی اسی پر محیط ہے۔دراصل وہ ہر زاویے سے خاتون کو خود اعتماد اور حوصلہ مند بنانا چاہتی تھیں تاکہ وہ تمام فیصلے خود کرسکیں اور معاشرے کو مضبوط بنا سکیں۔

''معاشیات''پر ان کی ایک کتاب''ڈومیسٹک اکونومی''کے عنوان سے ہے۔نواب سلطان جہاں بیگم نے اپنی نانی اور والدہ سے یہ سیکھا تھا کہ ریاست کی ترقی کے لیے اس کی مالی حالت مستحکم ہونا ضروری ہے اور اس کا انحصار نظم ونسق اور ذرائع پیداوار کی بہتری پر ہے۔انھوں نے ریاست کی باگ ڈور سنبھالتے ہوئے اس جانب جو عملی قدم اُٹھائے ان کا ذکر''گوہرِ اقبال''کے ابتدائی صفحات میں درج ہے:

> ''مالی حالت ریاست کی بوجوہ چند در چند نہایت قابلِ توجہ ہے اور رعایا
> میں افلاس و نادہندی سرایت کرگئی ہے۔اگرچہ اس میں مجھے بہت
> مشکلات کا سامنا ہوگا کیونکہ افتادہ زمینوں کا از سرِ نو آباد ہونا خصوصاً ایسی
> حالت میں کہ تقریباً ایک ثلث مردم شماری گھٹ گئی ہو بالضرور ایک اہم

کام ہے مگر جس احکم الحاکمین نے اپنے ملک اور اپنی مخلوق کی حفاظت
میرے سپرد کی ہے مجھے امید ہے کہ وہ ہر کام میں میرا معین و مددگار ہوگا۔''

(ص،15)

محکمۂ خزانہ کو چست درست کرنے کے ساتھ انھوں نے صنعت وحرفت پر بھر پور توجہ دی۔ انگریزوں کے اصول وضوابط کو سامنے رکھتے ہوئے کاشتکاروں کو سہولتیں مہیا کیں بلکہ انھیں جدید تکنیک سے واقف کرانے کا بھی جتن کیا۔ مال گزاری کا طریقہ بھی انگریزوں کا بہتر بتاتے ہوئے اسے جذب کرنے کی کوشش کی۔ اس اعتبار سے ''ڈومیسٹک اکونومی'' اہم کتاب بن جاتی ہے جو اس عہد کی معاشیات اور اس سے وابستہ معاملات کو بخوبی پیش کرتی ہے۔

بیگم سلطان جہاں نے کئی یادگار سفر کیے جن کی روداد مل جاتی ہے مگر جس سفرنامہ کو انھوں نے نہایت خلوص دل سے قلم بند کیا ہے وہ ''روضۃ الریاحین'' ہے۔ تخت نشینی کے دو سال بعد 28/اکتوبر 1903 میں وہ حج بیت اللہ کے لیے بھوپال سے بمبئی کے لیے روانہ ہوتی ہیں اور 4/اپریل 1904 کو فریضۂ حج سے فارغ ہو کر بھوپال واپس آتی ہیں۔ جانے سے پہلے عوام کی فلاح و بہبود اور ریاست کے لیے معقول انتظام کرتی ہیں بلکہ دوران سفر خطوط اور فرامین کے ذریعے ذمہ داری اور فرض دونوں کو بخوبی نبھاتی ہیں۔ سفر نامۂ کشور حجاز کے صفحات اس کے گواہ ہیں۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''اثناء سفر میں قواعد وقوانین ممالک غیر کی پوری پابندی کی جائے اور ممالک مذکور کے کسی شخص کے ساتھ خلاف احتیاط وتہذیب کوئی برتاؤ نہ کیا جائے بلکہ ہر معاملہ میں اپنی جانب سے حلم ومتانت ونرمی وفروتنی عمل میں آتی رہے۔ اگر کسی کی طرف سے کوئی سختی بھی دیکھی جائے تب بھی ہمیشہ اس سفر مبارک کی غرض پاک کو ہر قدم پر ملحوظ رکھ کر برداشت کیا جائے۔''

(ص،40)

یہ سفر نامہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں عرب و ہند کے تعلقات، جغرافیائی معلومات، حکومت کے انتظامات، احباب کے مشورے وغیرہ شامل ہیں۔ دوسرے حصہ میں گھوڑے، اونٹ اور پانی کے جہاز کے سفر کا دلچسپ ذکر ہے۔ مقامات مقدسہ کی تفصیلات، سلطان

ترکی کے حکم سے مسجد نبوی کی از سرِ نو تعمیر کا ذکر ہے۔ ذہنی اور قلبی سکون کے مناظر موثر انداز میں تحریر کیے گئے ہیں جس کی وجہ سے یہ محض سفر کی روداد ہی نہیں بلکہ صنفِ بیانیہ کا ایک دلچسپ اور مؤثر بیان بھی ہے۔ ایک منظر ملاحظہ ہو:

> ''جب ستون توبہ اور ستون سریر کے مابین بنیاد کھودی جا رہی تھی تو نیو میں ایک چشمہ نمودار ہوا جس کی خوشبو پھیل گئی۔ لوگوں نے تبرکاً اس کا پانی پیا تو نہایت خوش ذائقہ تھا۔ اس میں سے کچھ سلطان المعظم کے لیے بھی ہدیۃً بھیجا گیا اور عموماً اہل مدینہ منورہ اس پانی سے فیضیاب ہوئے۔ جب عمارت کے کام میں ہرج ہونے لگا تو متولی عمارت نے اس کا منبع تعمیر کے ذریعے بند کرا دیا اور نیو بھروا دی۔'' (ص،85)

سیاحت کا انھیں شوق تھا مگر اس کی فرصت کم ملتی تھی۔ ''سیاحت سلطانی'' میں اس کا ذکر بہت خوب ہے۔ مصروفیت کی وجہ سے جب ریاست سے باہر جانے کو نہیں ملتا تو وہ اپنے مضافات کے سفر کو نکلتیں تو مصوری کے سامان کو بھی ساتھ لے جاتیں اور پھر قدرتی مناظر کے نقش کاغذ پر کھینچ لیتیں۔ ازدواجی زندگی پر ان کی دو مکمل کتابیں ہیں۔ ''ہدیۃ الزوجین'' میں مختلف مثالوں کے ذریعے میاں بیوی کے باہمی تعلقات کو مضبوط اور خوشگوار بنانے کی ہدایتیں ہیں۔ وہ مذکورہ کتاب کے پہلے حصے میں لکھتی ہیں:

> ''معاشرت کی ابتدا ان تعلقات سے قائم ہوتی ہے جو زن وشوہر کے مابین ہوتے ہیں اس لیے پہلا حصہ ''ہدیۃ الزوجین'' کے نام سے شائع کرتی ہوں جس میں وہ تمام امور درج ہیں جو از روئے شرع شریف قائم ہیں۔'' (ص،5)

ڈاکٹر رضیہ حامد اپنی کتاب ''نواب سلطان جہاں بیگم'' میں لکھتی ہیں:

> ''اس کتاب کو لکھتے وقت ان کے پیش نظر نواب شاہجہاں بیگم کی 'تہذیب نسواں و تربیت الانسان' اور شمس العلما مولوی نذیر احمد کی 'الحقوق و الفرائض' کتب تھیں جن سے ان کو بہت مدد ملی۔'' (ص،213)

مذکورہ کتاب میں حکایت و روایت کے سہارے نکاح، تعداد ازدواج، حقوق زوجین، اختیارات زوجین، باہمی تعلقات، رشتوں کا پاس ولحاظ، درگزر، مفاہمت، طلاق، عدت، ترکہ وغیرہ پرنہایت مبسوط گفتگو ہے۔

خانگی معاملات اور گھر گرہستی پر ان کی کئی تقاریر ہیں جن میں امور خانہ داری کو موضوع بحث بنایا گیا ہے مگر اس موضوع پر ''معیشت خانہ داری'' کے عنوان سے انھوں نے بھر پور کتاب بھی لکھی ہے۔اس کے جزو اول کے دیباچہ میں وہ لکھتی ہیں:

> ''بلاشبہ اصول خانہ داری کا مضمون نہایت وسیع ہے کیونکہ جس طرح انسان خلاصۂ عالم یا عالم صغیر ہے اسی طرح گھر کو خلاصۂ دنیا یا دنیائے صغیر سمجھنا چاہیے۔گھر دنیا میں ہوتا ہے اور دنیا گھر میں ہوتی ہے۔اس لیے خانہ داری کے کل اجزا پر تفصیلی بحث کی جائے تو بہت سی ضخیم جلدیں تیار ہو سکتی ہیں۔مگر یہ کام ایک فرد واحد کی طاقت سے باہر ہے۔اس کے لیے اجتماعی قوت کی ضرورت ہے تاہم میں نے جہاں تک ہو سکا ہے اصولی اور کارآمد باتوں کو پیش نظر رکھا ہے۔'' (ص،ج)

اس کتاب میں مکان کے اندر و باہر کی آرائش، پائیں باغ اور لان کی ترتیب و تنظیم، آرائش کے اصول، الگ الگ کمروں کے فرنیچر وغیرہ کی اقسام اور ان کے رکھ رکھاؤ کی ترکیب، باورچی خانہ اور غسل خانہ کی زیبائش، مشرقی اور مغربی برتنوں کی صفائی ستھرائی کا طریقہ، ٹھنڈے اور گرم کپڑوں کے رکھنے کے آداب وغیرہ تمام تفصیلات کے ساتھ اس میں سمٹ آئے ہیں نیز ان سب کو کس طرح بازار سے منسلک کر کے آمدنی کو بڑھاتے ہوئے گھریلو تجارت کو فروغ دیا جا سکتا ہے؟ اس کے بھی طریقے بتائے گئے ہیں۔

''صحت عامہ'' پر ان کی دو بھر پور کتابیں ہیں۔پہلی کا عنوان ''تندرستی'' ہے۔اسے تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔حصہ اول میں خواتین کو ہدایت دی گئی ہے کہ وہ روز اول سے بچے کی صحت پر توجہ دیں۔دوسرے میں متعدی امراض سے بچاتے ہوئے اسے جدید اصولوں کے تحت ٹیکے وغیرہ لگوائیں تاکہ وہ ان جان لیوا امراض سے محفوظ رہ سکے۔تیسرا حصہ غذا سے متعلق ہے کہ

پانی کو ابال اور چھان کر پلائیں۔ کھانے کی چیزوں میں احتیاط برتیں اور صفائی ستھرائی سے بالکل چشم پوشی اختیار نہ کریں۔ وہ اس کتاب کے دیباچے میں لکھتی ہیں:

''اگر تم چاہتے ہو کہ صحت وتندرستی تمھارے چہرے کو منور اور تمھارے جسم کو توانا کردے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ عالی خیال سے تمھارا دماغ روشن اور نیک مزاجی سے تمھارا دل مطمئن ہو۔ جو لوگ سمجھتے ہیں کہ زندگی بہت سے لحوں کا مجموعہ ہے اور ہر ایک لحہ کو کسی مفید کام میں گزارنا چاہتے ہیں، وہ اپنے جسم کی مشین بھی اچھی حالت میں رکھتے ہیں۔'' (ص،8)

اس موضوع پر ان کی دوسری کتاب ''حفظان صحت'' کے نام سے ہے۔ انھوں نے انگریزی میں دستیاب حفظان صحت سے متعلق معلومات کو یکجا کرکے صحت وتندرستی کے اصول کو اپنے لب و لہجہ میں پیش کیا ہے۔ غلاظت و کثافت سے کس طرح بچا جائے، موسمی بخار اور انفکشن سے محفوظ رکھنے کی تدابیر، بدلتے ہوئے موسم میں غذا کا انتخاب واہتمام، جسم کے اندرونی اور بیرونی حصوں کی صفائی، ورزش وغیرہ کو موضوع بحث بنایا ہے۔ وہ تمہید میں اس طرح مختصر ہدایات کرتی ہیں:

''1۔ صفائی و پاکیزگی جس میں ہوا، پانی، غذا، جسم، لباس اور مکان کی صفائی شامل ہے۔ 2۔ اعتدال اور میانہ روی، ہر ایک کام میں اور خاص کر کھانے پینے میں۔ 3۔ روزانہ ورزش اور چہل قدمی۔ 4۔ ضبط اوقات۔ یہ چاروں باتیں قصر تندرستی کی چار دیواریں ہیں اور جب تک ان میں کوئی رخنہ نہیں پڑے گا انشاء اللہ کوئی بیماری آدمی پر غلبہ نہیں کرے گی۔'' (ص،ب)

تربیتِ خواتین ان کا بنیادی موضوع ہے۔ اس کے لیے انھوں نے بڑے جتن کیے۔ ان کے یہاں ڈپٹی نذیر احمد کی طرح دو واضح پہلو نظر آتے ہیں، تعلیم اور تربیت۔ خواتین کی تعلیم کے سلسلہ میں انھوں نے ان گنت وظائف مقرر کیے۔ ریاست اور ریاست سے باہر ان کے پڑھنے اور پڑھانے کا معقول انتظام کیا اور جو بچیاں اس جانب راغب نہیں ہو سکتی تھیں ان کے لیے کڑھائی، بنائی، کشیدہ کاری وغیرہ کے سینٹر قائم کیے بلکہ سوئٹر بُننے کا ایک باتصویر رسالہ بھی جاری کیا جو ''بُننگ''

کے نام سے مشہور ہے۔

خواتین کو ذہنی اور جسمانی طور پر صحت مند بنانے کے جتن تو کیے ہی ہیں، انھوں نے اُن کی تربیت کا بھی معقول انتظام کیا ہے کہ بچوں کی پرورش کیسے کریں؟ وہ یہ سمجھ چکی تھیں کہ بچے ہی کل کا روشن مستقبل ہیں لہٰذا ''بچوں کی پرورش'' کے عنوان سے ایک معیاری کتاب لکھی جو نو ابواب پر اس طرح مشتمل ہے:

1۔بچہ کی پیدائش اور ابتدائی نگہداشت۔ 2۔قدرتی آفات سے محفوظ رکھنے کی تدابیر۔3۔بدلتے ہوئے موسم سے محفوظ رکھنے کی تدابیر۔4۔روز بروز بڑھتے ہوئے بچوں کی ضروریات اوران کا رکھ رکھاؤ۔5۔ زمانۂ طفولیت کی عام بیماریوں سے بچنے کی تدابیر۔6۔مٹی وغیرہ چاٹنے سے پیٹ میں پیدا ہونے والے کیڑوں سے محفوظ رکھنے کی تدابیر۔7۔ شیر خواری کے بعد کی غذا کا اہتمام۔8۔نشو ونما میں مانع ہونے والے امراض سے بچنے کے طریقے۔9۔ان کی صحت کے ساتھ ساتھ ذہنی بیداری اور قوتِ حافظہ کو فعال بنانے کی تدابیر۔ ان کے علاوہ سادہ غذائیں اور مشروبات وغیرہ بنانے کے طریقے درج ہیں۔ان سب میں رائج طبی سہولیات کے ساتھ جدید انگریزی اصول بھی سمجھائے گئے ہیں۔''بچوں کی پرورش'' کے متعلق شیخ عبداللہ رقم طراز ہیں کہ:

> ''ہم اپنے اردو لٹریچر کو مبارکباد دیتے ہیں کہ اُس میں ایک ایسا اعلیٰ درجے کا اضافہ ہوا جس پر اردو لٹریچر جس قدر بھی ناز اور فخر کرے کم ہے۔'' (خاتون، جنوری 1914، ص، 28)

''فرائض النساء'' بھی اسی موضوع پر لکھی گئی اہم کتاب ہے۔اس کے گیارہ ابواب ہیں جن میں گھر گرہستی کی دیکھ بھال، مکان کے ساز و سامان، صفائی ستھرائی، وقت کی پابندی، معقول اور معتدل غذا، مہمان داری، قرب و جوار کی عیادت، بچوں کی نگہداشت جیسے عنوانات خواتین کی مکمل زندگی کا احاطہ کرتے ہیں اور یہ باور کراتے ہیں کہ گھر، ملک اور قوم کو بہتر بنانے میں عورت بے حد معاون ہوتی ہے لہٰذا اسے سکون مہیا کرنا معاشرے کا اولین فرض ہے۔اگر معاشرہ اس فرض کو پورا کرنے میں کوتاہی برتتا ہے تو خاتون اپنے فرض کو نبھانے میں فرحت محسوس نہیں کرسکتی ہے۔

''رہبرِ نسواں'' افسانوی رنگ اور مکالماتی لہجے میں لکھی گئی ہے۔اس میں تعلیم اور تربیت کو موضوع بناتے ہوئے یہ اجاگر کیا ہے کہ تعلیم گھر گرہستی میں مانع نہیں ہوتی ہے۔مہمان خانے اور باورچی خانے کے اپنے آداب ہیں اس سے غفلت برتنے سے بھی کی خصوصاً بچوں کی صحت خراب ہوسکتی ہے اور اقتصادی صورت حال بھی بگڑ سکتی ہے لہٰذا والدین کو چاہیے کہ بچوں کی تعلیم کے ساتھ تربیت بھی ضرور دلوائیں۔بچوں کو ذہن نشین کرایا جائے کہ وہ اسکول کے کاموں کے ساتھ ساتھ اپنے گھر کے کام کاج سے غفلت نہ برتیں۔مذکورہ کتاب کے دیباچہ میں لکھتی ہیں:

''.....وہ لڑکیاں جو مدارس میں تعلیم پاتی ہیں، اس تعلیم سے محروم رہ جاتی ہیں جو عورتوں کی ضروریاتِ زندگی اور معاشرے کے لحاظ سے مقدم ہے-----مذہبی تعلیم، اصولِ حفظان صحت، پرورش و تربیت اولاد بھی ضروری ہیں۔'' (ص،3)

''عفت المسلمات'' بھی خواتین کی تعلیم وتربیت پر مبنی کتاب ہے۔اس میں 'پردہ' اور 'حجاب' کو قدیم و جدید علما کے توسط سے موضوع بحث بنایا گیا ہے۔بیگم سلطان جہاں اس کے آغاز میں لکھتی ہیں:

''میں نے اس کتاب میں اپنی ذاتی رائے کو بہت کم دخل دیا ہے۔احکام مذہب یعنی آیات قرآنی اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو درج کرنے کے بعد ان کے متعلق مشاہیر علما کی جو رائیں ہیں وہ نقل کردی ہیں۔''

(ص،2)

وقت کے بدلتے ہوئے مزاج کو مصنفہ محسوس کررہی تھیں۔انھوں نے پردے میں رہ کر حکومت کی اور آخر میں اس کو ضرورتاً ترک بھی کیا۔دونوں پہلوؤں کو انھوں نے مغربی اور مشرقی مصنفین کے حوالوں سے بھی دیکھا ہے۔ڈاکٹر رضیہ حامد اس پر یوں تبصرہ کرتی ہیں:

''نواب سلطان جہاں بیگم نے عورتوں کے لیے عفت و حیا کو پورے دلائل کے ساتھ ضروری قرار دیا ہے۔انھوں نے اس میں قرآن وحدیث سے ٹھوس دلائل پیش کرنے کے بعد کئی ممالک میں پیش آئے واقعات بھی

> تحریر کیے ہیں۔ پردہ سماج میں ہونے والی خرابیوں کو پیدا ہونے سے روکتا ہے اور عورتوں کے ساتھ ملک وقوم کو ہونے والے نقصانات سے بچاتا ہے۔" (ص،223)

پانچ ابواب پر مشتمل اس کتاب میں پردہ، عفت اور حیا کو مشرق اور مغرب کے تناظر میں معروضی طور پر دیکھا گیا ہے۔ انداز موثر اور مدلل ہے۔ بعد میں "پردہ" کے عنوان سے ایک الگ کتاب لکھی جس میں تمدنی، مذہبی، اخلاقی، طبی اور سماجی زاویے سے نفع ونقصان کو واضح کیا ہے۔

خواتین کی تربیت کے ساتھ بچوں کی نگہداشت کے لیے بھی ایک کتاب بعنوان "تربیت الاطفال" لکھی ہے۔ بدلتے ہوئے معاشرے کی ضرورتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے انھوں نے مذکورہ کتاب کو دو حصوں میں منقسم کیا ہے۔ حصہ اول میں بچوں کی نگہداشت اور پرورش کے ساتھ مناسب تربیت کی رہبری کی ہے۔ حصہ دوئم میں صدیوں سے رائج اس موضوع پر چھوٹے چھوٹے قصوں سے نیا رنگ اور تاثیر پیدا کی گئی ہے۔ وہ اس کے دیباچہ میں لکھتی ہیں:

> "میں اس قدر ضرور کہوں گی کہ تربیت ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے ہم بچوں میں وہ تمام فضائل مثلاً شائستگی، تہذیب، اخلاق، پاکیزگی خیال اور دیگر صفات حسنہ پیدا کر سکتے ہیں جن کی ہر زمانہ میں اور ہر جگہ قدر کی جاتی ہے اور جن کی وجہ سے انسان ہر سوسائٹی میں وقعت اور عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اسی سے وہ روح اور جوہر بھی پیدا ہوتا ہے جو دنیا کے بڑے آدمیوں کا مایۂ امتیاز ہے اور جس کی وجہ سے انھوں نے دنیا کی تاریخ بدل دی۔" (ص،2)

# علی گڑھ سے خصوصی لگاؤ

**علی گڑھ** کے تعلق سے کہا جائے تو سلطان جہاں بیگم صاحبہ یہاں صرف سات[1] مرتبہ تشریف لائیں مگر ہر پل اس ادارہ کی خبر رکھی۔ مختلف امداد کے ساتھ غریبوں اور ہونہار بچوں اور بچیوں کے لیے وظائف مقرر کیے۔ بورڈنگ ہاؤس کے لیے رقم عطا فرمائی[2]۔ 1906 میں ایجوکیشنل کانفرنس کے لیے علاحدہ دفتر بنوایا۔ 1909 میں اس کی توسیع کرائی۔ 1910 میں کالج کے معائنہ کی غرض سے تشریف لائیں۔ جون 1910 میں پرنس حمیداللہ کا (ایم۔اے۔او۔کالج) داخلہ کرایا جنھوں نے 1911 میں ہائی اسکول، 1913 میں انٹرمیڈیٹ (سائنس)، 1915 میں بی۔اے۔ کی ڈگری حاصل کی[3]۔ 1911 میں یونیورسٹی تحریک شروع ہوئی تو انھوں نے نیک خواہشات اور دلی دعاؤں کے ساتھ فوری طور پر ایک لاکھ روپیہ عطا کیا۔ 28 فروری 1914 کو ہر ہائینس نے اسٹریچی ہال میں طلبا سے خطاب کیا۔ یکم مارچ 1914 کو مدرسۂ نسواں میں ان کی یادگار تقریر ہوئی جس نے اس دور کی خواتین میں حصولِ علم کا جوش اور ولولہ پیدا کر دیا۔ انھوں نے پاپا میاں کے اسکول میں لڑکیوں کی پڑھائی کے ساتھ رہائش کے لیے ہوسٹل کی بھی تعمیر کرائی۔ اولڈ بوائز لاج میں ایک بے حد وسیع کمرے کے علاوہ اپنے دونوں بیٹوں نواب محمد نصراللہ خاں اور نواب عبیداللہ خاں کے نام سے ہوسٹل اور کمرہ تعمیر کرایا۔ 1915 میں شمشاد مارکیٹ میں کانفرنس کمپاؤنڈ سے ملی ہوئی سلطان جہاں منزل بنوائی۔ 14 ستمبر 1920 میں کالج کو یونیورسٹی کا درجہ ملا تو بیگم

صاحبہ اس کی پہلی چانسلر مقرر ہوئیں اور تا حیات اس منصب پر فائز رہیں۔

نواب سلطان جہاں بیگم علی گڑھ میں بیٹھ کر جدید نصاب، لڑکیوں کی تعلیم و تربیت اور ان کی رہائش کے تعلق سے منصوبے بناتیں بلکہ مروجہ نصاب پر کھل کر بحث کرتیں۔ حیات سلطانی کے مؤلف محمد امین زبیری نے اسے تفصیل سے لکھا ہے:

''انگریزی کی تعلیم اور اس کے داخل نصاب ہونے کی بحث اور اعلیٰ مدارج تعلیم میں اس کے داخل کیے جانے کی تحریک، طریقۂ تعلیم، استانیوں اور قومی مدرسوں کی ضرورتیں، پردہ کے انتظام کی تاکید، یورپین اور ینٹو کرسچین لیڈیز سے فائدہ اٹھانے کی ترغیب، قوم کو عملی قوم بننے کی ہدایت، مدرسہ کی حالت پر ریمارک، 12-11 برس کی لڑکیوں کو مدرسہ سے اٹھائے جانے پر افسوس، لیڈی پورٹر 4 کا شکریہ غرض تمام مسائل حاضرہ زیر بحث لائے گئے تھے اور ان پر اپنی رائے ظاہر فرمائی تھی۔''

اسی زمانے میں مسلم لیڈیز کانفرنس کا ابتدائی اجلاس بھی اسکول کی عمارت میں ہوا۔ بیگم صاحبہ صدر جلسہ منتخب ہوئیں اور یکم مارچ 1914 کو مسلمان عورتوں کے ایک خاص اور خالص اجتماع صنفی کی بنیاد اُن کے دستِ مبارک سے رکھی گئی۔ انھوں نے اس موقع پر افتتاحی تقریر ارشاد فرمائی اور اس میں جن جذباتِ ہمدردی کا اظہار کیا اور جس طرح خواتین اسلام کو غیرت دلائی اور ان کو اجتماعی و انفرادی طور پر قومی و صنفی کام کرنے کی نصیحتیں کیں وہ بار بار خواتین اسلام کے مطالعہ کے قابل ہیں۔ یہ اجلاس اگرچہ ایک ہی دن ہوا لیکن تقریباً تمام دن خواتین اسلام اپنے اسی صنفی مسائل کی بحث میں مشغول رہیں۔ جب اجلاس ختم ہوا ہے تو نواب سلطان جہاں بیگم نے ارشاد فرمایا:

''خواتین! آج کے دن اس زمانہ کے مسلمانوں کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا ہے اور جب کبھی آئندہ زمانہ میں اس دور کی تاریخ لکھی جائے گی تو اس میں ہمارے اس جلسہ کا انعقاد ایک روشن باب ہوگا۔ چار سال قبل جبکہ میں یہاں آئی تھی اور اس روارومی کے قیام میں جن جن

خواتین سے مجھ کو موقع ملاقات ملا تھا اور اس وقت جبکہ میں نے ان کو دیکھا تو مجھ کو ان کے خیالات میں بین فرق معلوم ہوا۔ ہر ایک کا تعلیم کی طرف رجحان ہے ہر ایک اپنی اور اپنی اولاد کی تعلیم پر دلدادہ ہے یہی آثار ہیں جو ہماری قوم کے اقبال کو نمایاں کر رہے ہیں۔

اے خواتین! میں تم کو یقین دلاتی ہوں کہ تمھاری تعلیم و تربیت تمام مسلمانوں کی بہبودی کا باعث ہوگی۔ میں نہیں بیان کر سکتی کہ مجھے آج کے دلچسپ مباحثوں اور سرگری سے کس قدر مسرت ہوئی ہے۔ میری دعا ہے کہ تمام مسلمان عورتیں تعلیم کی حقیقی مسرت حاصل کریں۔ ان کی تعلیم ان کی خوشیوں کا ذریعہ بنے اور یہ کانفرنس بہت سی برکتوں کا باعث ہو۔ مجھے یقین ہے کہ آج جو خواتین اس کانفرنس کی رکن اور عہدہ دار منتخب ہوئی ہیں وہ اور بھی زیادہ استقلال سے کام کریں گی۔

خواتین! اب میں آپ سب کی اس تکلیف سفر برداشت کرنے پر شکریہ ادا کر کے اس دعا کے ساتھ تقریر ختم کرتی ہوں کہ خداوند کریم اس ضعیف طبقہ کی کوششوں میں مدد دے تا کہ وہ اتحاد و اتفاق کے ساتھ اپنی صنف کی خدمتیں بجالائے اور اس کا دل علم کی روشنی سے منور ہو۔"

"حیات سلطانی" کے صفحہ نمبر 179 پر درج ہے کہ اس وقت ہندوستان میں جس قدر زنانہ تعلیم کے نصاب جاری تھے ان کے نقائص اس قدر زباں زد تھے کہ کسی بیان کی حاجت نہیں اور اس تعلیم سے عورتیں ان خوبیوں سے محروم رہ جاتیں جن کا ذات نسواں میں موجود ہونا از حد ضروری ہے۔ لہٰذا سرکار عالیہ نے اس مسئلہ پر ابتدا ہی سے غور فرمایا، اور تقریباً اپنی تمام تقریروں میں اس کا اظہار کیا۔ مسلمان لڑکیوں کے لیے ایک جداگانہ نصاب بنانے کے واسطے علی گڑھ میں صرف مالی امداد عطا کی بلکہ جب اس نصاب کی چند کتابیں ملاحظۂ اقدس میں پیش کی گئیں تو ان پر نہایت گہری تنقید فرمائی۔ پھر ایک کمیٹی جو 1915 میں بمقام اٹاوہ منعقد ہوئی تھی اور جس میں مسلمانوں کے علاوہ وہ یورپین لیڈیز بھی شریک تھیں جن کو تعلیم نسواں کا تجربہ حاصل تھا اور سررشتہ تعلیم میں عہدہ

دار ہی تھیں، ایک منضبط خاکہ تیار کیا، اس پر بھی بیگم سلطان جہاں نے اپنی رائے ظاہر فرمائی۔نصر اللہ ہوسٹل کے افتتاح کا موثر نظارہ ان ہی کے الفاظ میں ملاحظہ کیجیے:

''حضرات! میں اس موقع پر ایک خاص امر کی جانب بھی توجہ دلانا چاہتی ہوں، اینٹ اور گارے چونے اور پتھر کی رفیع الشان عمارتیں بلاشبہ جاذبِ نظر ہوتی ہیں لیکن اُن کی حقیقی شان اُس وقت نمایاں ہوتی ہے جب اُن کے کاموں کے شاندار نتائج ظاہر ہوں۔دُنیا کی کوئی عمارت حجرۂ نبوی کی خام دیوار اور نیچی چھت سے زیادہ شاندار نہیں ہے۔یہ وہ مقدس عمارت تھی جہاں سے علم وعمل کے دریا موجزن ہوئے اور اُن سے وہ برقی قوت حاصل ہوئی کہ بحروبر منور ہوگیا۔آپ دیکھیے کہ مدرسہ نظامیہ بغداد اور مثل اس کے بہت سے مدارس کی عمارتوں کا باوجود اس کے کہ وہ بہت شاندار تھیں کوئی وجود موجود نہیں ہے لیکن اس کی علمی نہریں آج بھی جاری ہیں اگرچہ وہ منبع سے جدا ہو چکی ہیں۔مجھے عمر کی سترویں منزل پر پہنچ کر سب سے بڑی تمنا اور سب سے بڑی آرزو یہی ہے کہ میں اس دارالعلوم کو نہ صرف ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں ممتاز دیکھوں بلکہ وہ دنیا کی یونیورسٹیوں میں خاص امتیاز رکھتی ہو۔

حضرات! ہماری قوم نے انتہائی جدو جہد کے بعد یہ یونیورسٹی قائم کی ہے اور اس کو مسلم یونیورسٹی کے مبارک نام سے موسوم کیا ہے تو قدرتی طور پر ہم اس دارالعلوم میں مسلم کی نسبت سے جو برکت ہونی چاہیے اس کے آرزومند ہوتے ہیں۔''

پروفیسر صغیر افراہیم نے اپنے مضمون''بھوپال اور والیانِ بھوپال'' میں لکھا ہے کہ سرسید کی دوربین نگاہوں نے یہ دیکھ لیا تھا کہ ریاست بھوپال سے کالج کی تعمیر وترقی میں بہت مدد مل سکتی ہے چنانچہ انھوں نے والیان بھوپال سے رابطہ قائم کیا۔بیگم صاحبہ (نواب سکندر بیگم) بھی قوم کی سچی ہمدرد اور خیر خواہ تھیں اس لیے انھوں نے علی گڑھ تحریک کی ہر طرح سے مدد کی بلکہ سرسید احمد خاں کو

ایک بیش بہا انگوٹھی بطور اعزاز بھیجی۔ اس کا تفصیلی ذکر حیاتِ سکندری کے صفحہ نمبر 157 پر درج ہے، مدرستہ العلوم کے قیام سے نو سال قبل کے اس اقدام کا ذکر الطاف حسین حالی نے ''حیات جاوید'' میں اس طرح کیا ہے:

''نواب سکندر بیگم صاحبہ رئیسہ بھوپال نے جب یہ سنا کہ سر سید احمد خاں کی کوششوں سے ہندوستانیوں کی بھلائی کے لیے یہ سوسائٹی قائم ہوئی ہے تو جون 1866 میں انھوں نے بطور اظہار خوشنودی کے الماس کی انگوٹھی سر سید کے واسطے بھیجی۔ سر سید نے جلسۂ عام میں وہ انگوٹھی سوسائٹی کے اخراجات کے لیے دے دی۔'' (ص،254)

''حیاتِ شبلی''، ''حیاتِ سکندری'' اور ''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' میں درج ہے کہ ستمبر 1891 میں جب سر سید اپنے رفقا کے ساتھ نظام حیدر آباد سے ملنے دکن جا رہے تھے تو انھوں نے بھوپال میں قیام کیا۔ نواب شاہ جہاں بیگم کے دربار میں باریاب ہوئے اور کالج کے لیے مدد حاصل کی۔ اس وفد اور اس سے پہلے کے تعلق سے پروفیسر محمد نعمان خاں اپنی کتاب ''مشاہیر ادب اور بھوپال'' میں لکھتے ہیں:

''نواب سکندر جہاں بیگم اور شاہجہاں بیگم کے علاوہ بھوپال کے جن رؤسا نے سر سید احمد خاں کے تعلیمی اور فلاحی مشن میں دامے، درمے، سخنے، قلمے، قدمے ہر ممکن تعاون کیا ان میں منشی سید امتیاز علی وزیر اعظم بھوپال، میاں عالمگیر محمد خاں نمود، نواب مولوی سید ابوالنصر محمد علی حسن خاں........ کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔'' (ص،16)

جس طرح سر سید کے بعد اُن کے شاگردِ رشید شیخ محمد عبداللہ نے حصولِ علم کے میدان کو وسیع کیا اسی طرح سلطان جہاں بیگم نے علی گڑھ اور بھوپال کے رشتے کو مزید استحکام بخشا۔ خصوصاً خواتین کی تعلیم کے لیے شیخ عبداللہ اور نواب سلطان جہاں بیگم نے جو کارنامے انجام دیے ہیں وہ ہمیشہ سنہرے حروف میں رقم کیے جائیں گے۔ ڈاکٹر ارجمند بانو افشاں نے اپنی کتاب ''ریاست بھوپال اور مشاہیر اردو'' میں اس کو مدلل بیان کیا ہے۔

نارمل اسکول علی گڑھ کو بیگم سلطان جہاں نے جو عطیہ دیا اس کی تفصیلی خبر رسالہ ''خاتون'' دسمبر 1904 میں اس طرح شائع ہوئی:

''ہم کو امید ہے کہ ہمارے ناظرین بڑی خوشی سے یہ مژدہ سنیں گے کہ ہر ہائینس نواب سلطان جہاں بیگم جی۔ سی۔ آئی۔ ای۔ فرمانروائے ریاست بھوپال نے شاہانہ فیاضی سے علی گڑھ میں ایک لڑکیوں کا نارمل اسکول جاری کرنے کی غرض سے سو روپیہ ماہوار کا عطیہ صیغہ تعلیم نسواں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کو مرحمت فرمایا ہے۔ کل ہندوستان کے مسلمان اور بالخصوص ہماری خواتین ہر ہائینس کی مشکور ہوں گی کہ ہر ہائینس نے ان پر خاص احسان کیا ہے۔ جلسۂ کانفرنس میں اور نیز جلسہ تعلیم نسواں سیکشن میں ہر ہائینس کا شکریہ ادا کیا گیا ہے اور ہم کو معلوم ہوا ہے کہ دہلی کی خاتونیں عنقریب ایک جلسہ کر کے ہر ہائینس کا شکریہ ادا کرنے والی ہیں۔ ہر ہائینس کے فیاضانہ عطیہ نے ہماری کوشش اور امید میں ایک قسم کی جان ڈال دی ہے۔ علی گڑھ میں ایک اسکول قائم کرنے کی تجویز کانفرنس میں طے ہو گئی ہے اور ایک کمیٹی واسطے فراہم کرنے سرمایہ کی قائم ہو گئی ہے۔ جس میں اس وقت قریب ساٹھ کے ممبر ہیں۔ جن کے اسمائے گرامی ہم آئندہ پرچے میں چھاپیں گے۔ اور ہر ہائینس جناب بیگم صاحبہ اس کی پیٹرن یعنی سرپرست قرار پاویں گی۔''

اسی طرح ترتیب نصاب مدرسۂ نسواں علی گڑھ کے لیے بیگم صاحبہ کے عطیہ کی خبر جولائی 1907 کے شمارہ میں ان الفاظ میں شائع ہوئی:

''اس سے پیشتر بارہا خاتون کے صفحات میں ہم اس بڑے احسان کا اعتراف کر چکے ہیں جو حضور عالیہ ہر ہائینس بیگم صاحبہ آف بھوپال نے فرقۂ اناث پر کیا ہے اور کر رہی ہیں۔ اب ایک جدید ثبوت ہر ہائینس نے اپنی اس بڑی ہمدردی اور دلچسپی کا دیا ہے جو ان کو تعلیم نسواں کے ساتھ

ہے۔ ناظرین کو معلوم ہوگا کہ ہم ایک عرصہ سے اس فکر میں تھے کہ تعلیم نسواں کے لیے ایک عمدہ نصاب تیار ہو جائے۔ لیکن مالی دقتیں ہماری سد راہ تھیں۔ تاہم گزشتہ اشاعت خاتون میں اس نصاب کا ایک خاکہ شائع کیا تھا اور اپنا ارادہ ظاہر کیا تھا کہ بہت جلد یہ کام شروع کر دیں گے۔ خوش قسمتی سے خاتون کے پرچے میں جس میں وہ خاکہ تھا حضور عالیہ کی شاہانہ نگاہ سے گزرا اور حضور عالیہ نے فوراً بغرض ہماری دستگیری مبلغ پانچ ہزار روپیہ ترتیب نصاب کے لیے عطا فرمایا۔ حضور عالیہ کے اس احسان کو ہمارے ملک کی موجودہ خاتونیں اور آئندہ نسلیں بڑی شکر گزاری اور احسان مندی کے ساتھ یاد کریں گی۔ اور ہم حضور عالیہ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے کافی الفاظ نہیں پاتے۔ صرف اس دعا پر اکتفا کرتے ہیں۔ کہ خداوند عالم حضور عالیہ کے دولت و اقبال و مراتب میں روز افزوں ترقی دے اور ان کا فیض عام خواتین کی بہتری اور بہبودی کے لیے قائم اور جاری رکھے۔''

اگست 1907 میں علی گڑھ کالج کے نارمل اسکول کے لیے مخصوص امداد کی خبر ملاحظہ کیجیے:

''گزشتہ پرچے میں ہم نے ناظرین 'خاتون' اور قوم کو خوشخبری سنائی تھی کہ جناب سرکار عالیہ ہر ہائینس بیگم صاحبہ بھوپال نے مبلغ پانچ ہزار روپیہ واسطے ترتیب نصاب کے دیے ہیں۔ اس پرچہ میں ہم قوم کو ایک نہایت اہم خوشخبری سناتے ہیں۔ ناظرین کو یاد ہوگا کہ گزشتہ سال تعلیم نسواں کمیٹی کی طرف سے ایک ڈپوٹیشن بغرض حصول امداد حضور لفٹنٹ گورنر بہادر کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اور حضور ممدوح نے وعدہ فرمایا تھا کہ آئندہ بجٹ میں زنانہ اسکول علی گڑھ کی امداد کا لحاظ رکھا جائے گا۔ اس کے بعد خط و کتابت برابر ہوتی رہی اور گزشتہ مارچ میں انسپکٹرس صاحبہ حلقہ اول نے اسکول کو ملاحظہ بھی فرمایا اور رپورٹ بھی کی۔ اب سرکار عالیہ کی طرف سے

حکم امدادی جاری ہوا ہے جس کی رو سے مبلغ پندرہ ہزار روپیہ نقد واسطے تعمیر مکانات کے اور ڈہائی سو روپیہ ماہوار تک کی امداد منظور فرمائی ہے۔ اگر آج ہمارے پاس ڈھائی سو روپیہ کی آمدنی ہو تو ہم پورے ڈھائی سو گورنمنٹ سے لے سکتے ہیں اور اگر سو روپیہ کی آمدنی ہوگی تو صرف سو روپیہ ہی ملے گا۔ اب بعد اس خوشخبری کے قوم سے التجا ہے کہ ایک چالیس ہزار روپیہ کی رقم کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ اگر چالیس ہزار روپیہ جمع ہو جائے تو کل امداد کے ہم مستحق ہو جاویں گے۔ اور مدرسہ نہایت شان سے چلنے لگے گا۔ گورنمنٹ عالیہ کی شکرگزاری ہر مسلمان پر واجب ہے۔''

پروفیسر شان محمد، پروفیسر اصغر عباس، پروفیسر صغیر افراہیم، جناب سید محمد حامد اور جناب مہر الٰہی ندیم نے اس موضوع پر تفصیل سے لکھتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ سر سید اور ان کے رفقا کی دور بین نگاہوں نے یہ بھانپ لیا تھا کہ علی گڑھ کے تعلیمی مشن میں بھوپال کی روشن خیال، بیدار مغز اور وسیع النظر خواتین سے بہت مدد مل سکتی ہے۔ نواب سلطان جہاں بیگم نے ایسا ثابت کر دکھایا۔ ان کو اس کا شدید احساس تھا کہ کوئی ملک یا قوم جدید تعلیم و تربیت کے بغیر ترقی نہیں کر سکتی ہے۔

---

1. :1910 سوری سے واپس ہوتے ہوئے کالج کے معائنہ کی غرض سے انھوں نے پہلی بار علی گڑھ میں قیام کیا۔

1922 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی چانسلر کی حیثیت سے جلسہ تقسیم اسناد کے فرائض انجام دیے۔

1914 طریقہ تعلیم کے تعلق سے مختلف امور پر گفتگو کے سلسلے میں۔

1915 سلطان جہاں منزل کے افتتاح کے لیے۔

1925 جب یونیورسٹی کا ایک اہم جشن منایا جا رہا تھا تو انھوں نے اس کے تمام انتظامات دیکھے اور اپنی تقریر میں فرمایا:

''مجھے عمر کی سترھویں منزل پر پہنچ کر سب سے بڑی تمنا اور سب سے بڑی آرزو یہی ہے کہ میں اس دارالعلوم کو نہ صرف ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں ممتاز دیکھوں بلکہ یہ دنیا کی یونیورسٹیوں میں خاص

مقام رکھتی ہو۔''

1926 کانووکیشن میں کامیاب طلبا میں ایک مسلم لڑکی کا نام دیکھ کر بے حد خوش ہوئیں۔

1929 میں انھوں نے آخری بار قدم رنجہ فرمایا۔

2 بھوپال اور والیان بھوپال، از پروفیسر صغیر افراہیم، ص،173۔

3 سرسید تحریک کو تقویت پہنچانے والی خاتون نے اپنے اس دانشورانہ عمل سے ملک میں بلا واسطہ طور پر یہ پیغام دیا کہ ایم۔ اے۔ او۔ کالج میں تعلیم وتربیت کا معیاری انتظام ہے۔ اسی کے بعد دوسری ریاستوں کے مسلم اور غیر مسلم رؤسا نے بلاجھجک اپنے بچوں کا داخلہ کرایا جس سے برصغیر میں ایک طرح کا سماجی، تہذیبی اور تعلیمی ربط بڑھا جو آج تک جاری وساری ہے۔

4 آنریبل مسٹر پورٹر قائم مقام لفٹنٹ گورنر کی لیڈی صاحبہ جنھوں نے اس مدرسہ کے لیے نہایت دلچسپی وہمدردی کا ثبوت دیا تھا۔

# ہندو مسلم اتحاد کی سعیِ جمیل

بیگم سلطان جہاں کے تعلیمی اقدام کے ساتھ ساتھ عوام سے بے پناہ محبت واُنسیت کے جذبے اور اُن کے ہندو مسلم اتحاد کی کوششوں کو بھی بے پناہ سراہا گیا ہے۔انھوں نے عوام وخواص کو احساس دلایا کہ ہندوستان روزِ اوّل سے امن وانسانیت کا گہوارہ اور ظلمتوں کی فضاؤں میں دمکتا ہوا ماہتاب رہا ہے۔موہن جوداڑو اور ہڑپا، اجنتا اور ایلورا کے نشانات، قطب وتاج کے اونچے مینار اس کی عظمتوں کے گواہ ہیں۔اس ملک میں مختلف مذہب کے لوگ آباد ہیں تاہم ان سب کی قومی حیثیت ایک ہے۔جس طرح چمن میں کھلنے والے رنگا رنگ پھول اپنی انفرادیت کے باوجود گل دستے میں مجموعی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں اسی طرح جُدا جُدا شکل وصورت اور زبان وعقائد کے لوگ قومی اعتبار سے ایک ہی صف میں شامل ہوکر محمود وایاز کی تمیز ختم کر دیتے ہیں۔ان کے عقائد، رسم ورواج ایک دوسرے سے متاثر ہیں۔یہ قدرِ مشترک اس مردم خیز خطے کی دین ہے جس میں زمانۂ قدیم سے ایسی برگزیدہ اور معجز نما شخصیتیں پیدا ہوتی رہی ہیں جنھوں نے علم وحکمت، شعرو ادب اور رشد وہدایت کے ساتھ ساتھ اصلاحِ ملک وملت اور قوم ووطن کی بے لوث اور قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں اور سب مذہبوں کی توقیر وتعظیم کی ہے۔قومی اتحاد، پیار ومحبت، امن اور رواداری کی جیتی جاگتی مثال ہے ''اردو''۔بیگم صاحبہ کی تحریریں اور تقریریں اس کی غماز ہیں کہ انھوں نے ملک میں امن واتحاد کی بھرپور کوشش کیں اور یہ احساس دلایا کہ کھڑی بولی، ہندومی،

ریختہ وغیرہ کے نام سے پہچانی جانے والی یہ لشکری زبان ملک کے مختلف علاقوں میں عسکری قوت بن کر نہیں بلکہ صوفی سنتوں کے سایہ تلے پھلتی پھولتی رہی ہے۔ عربی کا جلال، فارسی کا جمال اور سنسکرت کی چھا جانے اور گھر کر لینے والی کیفیت اس کے رگ و ریشے میں پیوست ہے۔ اس آویزش اور آمیزش کی بنا پر ہی یہ روز اول سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی تعلقات کی امین رہی ہے۔ مشترکہ تہذیب اور محبت و اخوت کی علامت کے طور پر ابھرنے والی یہ زبان ہمیشہ سے ذات پات، فرقہ وعقیدہ، دیر و حرم کی تخصیص و تمیز سے مبرّا نظر آتی ہے۔

سید محمد امین زبیری مارہروی ریاست بھوپال کے ہندو مسلم اتحاد کی ان گنت مثالوں کے ساتھ لکھتے ہیں کہ:

> ''ہندستان میں اگر چہ صدیوں سے ہندو مسلمان اتحاد و اتفاق کے ساتھ رہتے تھے جس کا ثبوت شہروں، قصبوں اور دیہات کی قدیم آبادیوں اور ان دونوں قوموں کے مکانات و معابد کے اتصال والحاق سے ملتا ہے لیکن جب سے کہ تعلیم میں تاریخ جدید کا عنصر شامل ہوا اور مسلمانوں کا عہدِ حکومت ظلم و جور کا زمانہ دکھلایا گیا دلوں میں تعصب پیدا ہو گیا اور پھر متعصب وخودغرض اشخاص کی جماعتوں نے اس تعصب کو اس درجہ پر پہنچا دیا کہ ہر جگہ نائرۂ فساد مشتعل ہونے لگا تا آنکہ یہ تعصب و فساد ملک کے امن و ترقی کے لیے خطرہ بن گیا چونکہ سرکار عالیہ فطرتاً امن پسند اور شفقت ورافت کا مجسمہ تھیں۔ ناممکن تھا کہ حضور ممدوحہ کا دل اس بات پر بے چین نہ ہوتا انھوں نے ہمیشہ رواداری اور امن و آشتی کی ہی تلقین فرمائی اور مساعی اتحاد کو عزت وقدر کی نظروں سے دیکھا۔'' (ص،154-153)

انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں فسادات کا جو سلسلہ جاری ہوا تھا اس سے متاثر ہو کر جب 1920 میں ہندو مسلم رہنمایانِ ہند نے شملہ میں ایک اتحاد کانفرنس منعقد کی اور ہزا کسیلینسی لارڈ اردن نے ان رہنماؤں کے سامنے ایک نصیحت آمیز تقریر فرمائی تو نواب سلطان جہاں بیگم نے ہزا کسیلینسی کو حسب ذیل تار دیا:

''آپ کی شملہ کی تقریر کا مجھ پر بہت اثر ہوا۔ اس تقریر میں آپ نے اپنے خیالاتِ عالیہ کا نہایت مناسب طریقے سے اظہار فرمایا ہے۔ نیک نیتی اور خیر خواہی کے جن جذبات نے اس انسانی ہمدردی کے اور دانشمندانہ فعل کی طرف آپ کو متوجہ کیا ہے اس کی بنا پر ہندستانیوں کو آپ کا شکرگزار ہونا چاہیے۔ آپ کی دل ہلا دینے والی تقریر پڑھنے کے بعد مجھ جیسی ایک ضعیفہ بھی خاموش نہیں رہ سکتی اور اسی وجہ سے میں اپنی تمام خدمات آپ کے سامنے پیش کرتی ہوں تاکہ آپ ان سے جس قسم کا کام بھی ممکن ہو لیں۔ جس شریفانہ مقصد کے حصول کے لیے آپ اس بےلوثی کے ساتھ کوشش فرمارہے ہیں اس میں ہر قسم کی امداد دینے کے لیے میں ہر وقت تیار ہوں۔ میں اپنا وہ پیام بھی درج کرتی ہوں جو میں نے مختلف الخیال رہ نمایانِ ہند کے نام بھیجا ہے جو آج شملہ میں جمع ہیں۔ مجھے قوی امید ہے اور میری خواہش ہے کہ یہ رہنمایانِ قوم موقع کی اہمیت کا صحیح اندازہ لگائیں گے اور جناب والا نے اس مسئلہ کے حل کرنے میں جس امداد کا وعدہ فرمایا ہے اس سے پورا فائدہ اٹھانے میں پس وپیش نہ کریں گے۔''

رہنمایانِ ہند کے نام حسب ذیل پیام تھا:

''کبرسنی سے فطرتاً یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ انسان گوشہ نشینی اختیار کرے اور دنیوی مشاغل سے نجات حاصل کر کے اپنا سارا وقت اپنے معبود حقیقی کی عبادت میں صرف کرے اسی خواہش نے اب سے ڈیڑھ سال قبل مجھے اس فیصلہ پر مجبور کیا کہ میں عنانِ حکومت اپنے عزیز فرزند یعنی موجودہ والیِ بھوپال کے ہاتھ میں دے دوں لیکن جس اطمینانِ قلب اور تفکرات سے آزادی کی مجھے تلاش تھی وہ مجھے نصیب نہ ہوئی۔ ملک کے ایک گوشہ سے لے کر دوسرے گوشہ تک ہندو مسلم مناقشات کی پھیلی ہوئی رو دیکھ کر

اوراس نے ہندستانیوں کے برادرانہ تعلقات میں جوخرابی پیدا کردی ہے اور آئے دن ہندوستان میں جو کشت وخون ہوتا رہتا ہے اس کی خبریں روزانہ اخبارات میں پڑھ کر مجھے جتنی تکلیف ہوئی اتنی زندگی بھر میں کبھی نہیں ہوئی تھی۔ ہماری باہمی خانہ جنگی کے دردناک نتائج کو دیکھ کر مجھے سخت تکلیف ہوا کرتی تھی لیکن میں یہ خیال کرتی تھی کہ آخر مجھ جیسی ایک ضعیفہ اس پیرانہ سالی میں ان دولڑنے والی قوموں میں صلح واتحاد کرانے میں کیا امداد پہنچا سکتی ہے۔ لیکن 29 اگست کی وائسرائے کی دل ہلا دینے والی اپیل جو انھوں نے اپنی شملہ کی تقریر میں کی اس سے اور اسی کے بعد ریاستِ بھوپال کی مجلسِ قانون ساز کے موقع پر میرے عزیز بیٹے نے جن جذبات کا اظہار کیا ہے ان سے میری ہمت بندھی اور مجھ میں یہ خواہش پیدا ہوئی ہے کہ اپنے برادرانِ وطن کی فلاح وترقی کے لیے اس مسئلہ کے حل کرنے میں میں بھی اپنی حسبِ استطاعت حصہ لوں۔ مجھے اس خبر سے بہت اطمینان حاصل ہوا کہ مختلف فرقوں کے رہنما شملہ میں جمع ہو کر اس ناگوار قضیہ کے حل کی کوئی خوشگوار صورت تلاش کر رہے ہیں۔ خدائے قدوس آپ لوگوں کی کوششوں کو وہی کامیابی عطا کرے جس کے وہ مستحق ہیں —— آپ حضرات کے [illegible] وطن پرستی سے میری پُرزور درخواست ہے کہ ہماری مشترکہ مادرِ وطن [illegible] سے اس بدنما دھبہ کو مٹانے کے لیے آپ کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کریں۔ میری خواہش ہے کہ میری کمزور لیکن دل سے نکلی ہوئی صدا میرے بدنصیب برادرانِ وطن کے کانوں تک پہنچے۔ گو میں ضعیف وناتواں ہوں۔ پھر بھی بہ خوشی اس پر آمادہ ہوں کہ گوشۂ عافیت ترک کر کے اپنی خدمات خواہ وہ کتنی ہی حقیر ہوں ملک کے لیے پیش کر دوں جنھیں وہ لوگ جو دو بڑی قوموں کے جنگجو طبقہ میں اتحاد واتفاق پیدا کرنا چاہتے ہیں، جس طرح چاہیں کام میں لائیں کیونکہ یہ مقدس مقصد جس

طرح مجھے عزیز ہے یقیناً ہر اس شخص کو محبوب ہوگا جو ملک کا بہی خواہ ہے۔"

(حیات سلطانی، ص، 155-154)

تمام ہندو مسلم رہ نماؤں پر اس برقی پیغام کا بہت گہرا اثر پڑا اور ہر شخص کے دل میں جذبات اتحاد کی ایک زبردست لہر پیدا ہوگئی اور کانفرنس کے پہلے اجلاس نے سرکار عالیہ کی خدمت میں یہ جواب ارسال کیا کہ:

"ہندو مسلم اور سکھ لیڈران جو ملک میں پیدا شدہ نا قابلِ برداشت صورتِ حالات پر غور کرنے اور ملک میں فرقہ وارانہ اتحاد و خوشگوار تعلقات برقرار رکھنے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ یور ہائی نس کے اس پُر اثر پیغام پر اظہار سپاس کرتے ہیں جس میں حضور عالیہ نے ابناء وطن کی موجودہ حالت سے اظہار ہمدردی و ترحم فرمایا ہے اور یور ہائی نس کے اس ارادہ پر اظہار تشکر کرتے ہیں جس میں حضور عالیہ نے باوجود پیرانہ سالی کے اعلیٰ جذبات سے متاثر ہو کر گوشہ عافیت ترک کرکے جس کی یور ہائی نس بجا طور پر مستحق ہیں اپنے وطن اور اہل وطن کی فلاح و بہبود کی خاطر تکالیف برداشت کرنے کے لیے آمادگی ظاہر کی ہے۔ یور ہائی نس کے پیغام نے حاضرین کانفرنس کے دلوں کو بے حد متاثر کیا ہے۔ یہ کانفرنس یور ہائی نس کے اس خیال سے بالکل متفق ہے کہ ہر محب وطن کا فرضِ اولین یہی ہے کہ مادر وطن کے چہرہ سے اس بدنما دھبہ کو دور کرے اور ان خرابیوں کے قطعی ازالہ میں جو رکاوٹیں ہیں ان سب کو دور کرنے کے لیے انتہائی کوشش کرے۔ یہ کانفرنس اپنے کو خوش قسمت تصور کرے گی اگر بوقتِ ضرورت یور ہائی نیس کی امداد و اعانت حاصل کرے اور امید ظاہر کرتی ہے کہ مادرِ وطن ہند کے سچے فرزندان و دختران بلا امتیاز مذہب و ملت یور ہائی نس کی تقلید کریں گے۔" (ص، 156)

ہزاکسلنسی وائسرائے نے بھی حسب ذیل جواب دیا کہ:

''یور ہائی نس نے اپنے تار میں جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے ان کی وجہ سے آپ کا ممنون ہوں، مجھے اب کسی مزید یقین دلانے کی ضرورت نہیں کہ آپ نے جس طرح اپنی زندگی کا بڑا حصہ اپنی رعایا کو آرام و آسائش پہنچانے میں صرف کیا ہے، اسی طرح قیام امن و صلح کے لیے بھی آپ اپنے اثر سے کام لیں گی اور مجھے یقین ہے کہ آپ اور دیگر حضرات اس کام کے لیے جو کوشش کر رہے ہیں وہ کامیاب ثابت ہوگی۔''

(ص،156)

ان مساعی اتحاد نے ملک میں ایک تدریجی اثر پیدا کر دیا تا آنکہ 1928 میں ہندو مسلم رہنماؤں اور ملک کے دیگر فرقوں میں ایک ایسا سیاسی سمجھوتہ ہوگیا، جس پر بقول محمد امین زبیری اتحاد ملکی و قومی کی شاندار عمارت تیار ہونے کی امید تھی۔ بہر حال بیگم سلطان جہاں اس مقصد میں بھی پوری طرح کامیاب رہیں کہ ان کے عہد میں ریاست قومی اتحاد اور مشترکہ تہذیب کی مثال بنی رہی۔

---

1 : نواب سکندر جہاں بیگم کے زمانے سے اردو سرکاری زبان بن چکی تھی مگر سلطان جہاں بیگم نے ملک کے نامور ادیبوں کی حوصلہ افزائی اور سرپرستی اس طرح کی کہ وہ دور دور سے بھوپال کی طرف رجوع کرنے لگے۔ انجمن ترقی اردو اور مولوی عبدالحق کی مدد کی۔ سیرت النبی کی اشاعت کا بندوبست کیا۔ وہ خود باکمال مصنفہ تھیں انھوں نے چالیس سے زیادہ کتابیں تصنیف کیں جو سبھی اردو زبان میں ہیں اور جب تک حیات رہیں تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رکھا۔

# اختتامیہ

بیگم سلطان جہاں بے حد حساس خاتون تھیں۔ انھوں نے اپنی قوتِ ارادی، تعمیری سوچ، شعر فہمی اور علم دوستی کی بدولت ریاستِ بھوپال کو تاریخ کے اوراق میں زندہ اور تابندہ کر دیا۔ ان کا دورِ حکومت (1926-1902) بہتر نظم ونسق کے اعتبار سے بھی سُنہرے حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے۔ انھوں نے ایک نازک دور سے گزر رہی ریاست بھوپال کو اپنوں اور غیروں کی سازشوں سے محفوظ کرنے کے جتن کیے۔ ''مجلس وضع قوانین'' اور ''مجلسِ شوریٰ'' کو بے حد فعال بناتے ہوئے قوانینِ زراعت وعدالت کو چُست دُرست کیا۔ پولیس اور فوج کی از سرِ نو تنظیم کروائی۔ سماجی، ذہنی اور تہذیبی تربیت کے لیے جدید طرز کے اسپتال بنوائے، ریل کے نظام کا معقول بندوبست کیا، کارخانے لگوائے اور اشاعتی اداروں کو وسعت دی۔

اس پُر وقار خاتون کی قومی ہمدردی، فیاضی اور دریا دلی کے اَن گنت قصے ہیں۔ انھوں نے عوام کو تصورات وتخیلات کی وادیوں سے نکال کر حقیقت کی سنگلاخی سے روشناس کرایا۔ علم کی اہمیت اور افادیت کا احساس دلایا اور طبقۂ نسواں میں اس کے پھیلاؤ کو اپنا نصب العین بنایا۔ قدیم وجدید کے امتزاج سے درس گاہوں کے لیے ایسا متوازن نصاب تیار کروایا جو مشرقی علوم کی خوبیوں کے ساتھ مغربی فنون کی ضروریات پر مشتمل تھا۔

آہنی عزم کی مالک اِس پُر وقار خاتون کی قومی ہمدردی، فیاضی اور دریا دلی کے اَن گنت قصے ہیں۔

والیِ ریاست بھوپال، نواب سلطان جہاں بیگم کی ہشت پہلو شخصیت کی مثال اُس ترشے ہوئے ہیرے سے دی جا سکتی ہے جس کو کسی بھی طرف سے دیکھنے پر اُس کی چمک آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہے۔ چاہے مصنفہ کی حیثیت ہو یا سوشل ریفارمر کی، علم پروری کا ذوق ہو یا ریاست کے فرائضِ منصبی۔ تعلیم و تربیت کا شوق ہو یا ملک و قوم کی خدمت کا جذبہ۔ اُن کی خدمات جلیلہ نا قابل فراموش ہیں۔ سید اختر حسین کی تحقیق کے مطابق بیگم سلطان جہاں، دنیا کی پہلی خاتون چانسلر تھیں اور ان کی ''ریاست بھوپال، برٹش راج میں دوسری بڑی مسلم اسٹیٹ'' تھی۔ وہ مشرق کی آخری تاجدار خاتون ہیں جن کے کارناموں پر مرد سلاطین و امرا بھی رشک کر سکتے ہیں۔ ربع صدی پر مشتمل ان کا دورِ حکومت بھوپال کا زرین عہد تھا۔ وہ مشرقی و مغربی تعلیم و تمدن کا ایسا سنگم تھیں جو آج بھی مصلحین امت کا آئیڈیل ہے۔ زندگی کے آخری ایام تک وہ ملک و قوم کی خدمات انجام دیتی رہیں اور خواتین کو تعلیم کی اہمیت نیز اُن کے حقوق سے آشنا کراتی رہیں۔ پچیس سال حکومت کرنے کے بعد امورِ سلطنت اپنے فرزند نواب حمید اللہ خاں کے سپرد کیے اور خدمتِ خلق کرتے ہوئے 12 مئی 1930 کو 72 سال کی عمر میں اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملیں۔ یہ نہ صرف ایک فرماں روائے ریاست کی موت تھی بلکہ ایک اعلیٰ درجہ کی خطیب، مصنف، مصلحِ قوم اور طبقۂ اناث کی محسن اور رہبر کی موت تھی۔ تاریخ ہند کے اوراق کو پلٹ کر دیکھیں تو مسلم خواتین میں بیگم سلطان جہاں جیسی نامور، مایۂ ناز اور عدیم المثال خاتون ملنا مشکل ہے، بالخصوص نسائی طبقہ میں وہ ہمیشہ باعثِ صد افتخار رہیں گی۔

جو یہ سچ ہے کہ اچھے لوگ دُنیا میں نہیں مرتے
تو سلطان جہاں زندہ ہیں جب تک ہے جہاں باقی

(سید محمد یوسف قیصر)

# بیگم سلطان جہاں ماہ وسال کے آئینے میں

**1858**

9 جولائی کو سلطان جہاں موتی محل میں پیدا ہوئیں۔
پیار سے انھیں اُمۃ الرحمٰن بھی کہا جاتا تھا۔

**1859**

میں نواب سکندر بیگم کو اپنے حقوق جانشینی وحکومت کے متعلق کامیابی حاصل ہوئی۔

**1860**

نواب نظر محمد خاں کے وارث کی حیثیت سے نواب سکندر بیگم باضابطہ مسند نشین ہوئیں۔

**1861**

بیرسیہ کا زرخیز علاقہ حکومتِ بھوپال میں شامل ہوا۔

**1862**

3 نومبر کو بیگم سلطان جہاں کی تقریب بسم اللہ ہوئی۔

**1867**

24 جون کو ان کے والد محترم نواب باقی محمد خاں (شوہر نواب شاہ جہاں بیگم) کا انتقال ہوا۔

**1868**

30 اکتوبر بروز جمعہ کو سکندر بیگم کا انتقال (52 سال کی عمر میں) ہو گیا۔
16 نومبر کو بیگم سلطان جہاں ولی عہد قرار دی گئیں۔

**1871**

8 مئی کو شاہ جہاں بیگم نے مولوی صدیق حسن خاں سے عقدِ ثانی کیا۔
سلطان جہاں بیگم کی تقریب نشرہ نہایت شاندار طریقہ پر کی گئی۔

**1873**

17 اکتوبر کو رسم منگنی ادا ہوئی۔

**1875**

یکم فروری بروز منگل کو شوکت محل میں نواب احمد علی خاں سے شادی ہوئی۔ قاضی زین العابدین نے نکاح پڑھایا اور دو کروڑ روپیہ مہر مقرر ہوا۔
3 فروری کو باغ نشاط افزا میں چوتھی کی رسم ادا ہوئی۔
25 نومبر کو صاحبزادی بلقیس جہاں کی ولادت ہوئی۔

**1876**

2 دسمبر کو محمد نصر اللہ خاں کی ولادت ہوئی۔
اپنوں اور غیروں کی سازشوں کی بدولت مولوی صدیق حسن پر سخت اعتراضات ہوئے۔ یہ سلسلہ دراز ہوتا گیا۔ بیگم سلطان جہاں سے بھی اختلافات بڑھے۔

**1877**

سلطان جہاں بیگم والدہ محترمہ کے ہمراہ دہلی میں منعقد دربار قیصری میں شرکت کے لیے گئیں۔

**1878**

2 نومبر کو محمد عبید اللہ خاں کی ولادت ہوئی۔

**1880**

3 اگست کو صاحبزادی آصف جہاں کی ولادت ہوئی۔

**1881**

17 دسمبر کو 83 سال کی عمر میں نواب قدسیہ بیگم کا انتقال ہوا۔

**1882**

مارچ میں کلکتہ کا سفر کیا۔ لارڈ اور لیڈی رپن سے ملاقات کی۔

**1883**

فروری میں صاحبزادی بلقیس جہاں کی تقریب نشرہ دھوم دھام سے ہوئی۔

**1886**

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے لیے وزیر بھوپال، مولوی امتیاز صاحب اور احمد علی حسن خاں (صاحبزادہ نواب صدیق حسن خاں شوہر نواب شاہ جہاں بیگم) نے مالی مدد کی۔

**1888**

بلقیس جہاں بیگم کا بارہ برس اور چھ ماہ کی عمر میں انتقال ہوا۔

**1890**

20 فروری کو مولوی صدیق حسن خاں کا انتقال ہوا۔
دسمبر میں نہایت سادگی کے ساتھ نواب نصر اللہ خاں اور نواب محمد عبید اللہ خاں کا عقد ہوا۔

**1891**

یکم ستمبر کو سرسید احمد خاں بھوپال تشریف لائے۔ ان کے ہمراہ حالی، شبلی، ذکاء اللہ اور زین العابدین تھے۔ نواب شاہجہاں بیگم نے سلطان جہاں کی موجودگی میں محمڈن کالج اور اس کی مسجد کی تعمیر کے لیے 21 ہزار روپیہ دیے۔ بعد میں دو ہزار روپے اور بھجوائے گئے۔

**1892**

شاہجہاں بیگم نے لیڈی لینسڈون ہاسپٹل قائم کیا جس میں دایہ گری کی تعلیم کا بھی انتظام تھا۔

**1894**

22 جولائی کو آصف جہاں بیگم کا چودہ برس اور چھ ماہ کی عمر میں انتقال ہوا۔
9 دسمبر کو نواب حمید اللہ خاں کی ولادت ہوئی۔

**1897**

زبردست قحط پڑا۔ ولی عہد کی حیثیت سے بیگم سلطان جہاں نے انتظامات دیکھے۔

**1898**

امسال بھی شدید قحط پڑا جس کے انتظامات بیگم صاحبہ نے دیکھے۔
27 مارچ کو علی گڑھ میں سر سید احمد خاں کا انتقال ہوا۔ نواب سلطان جہاں بیگم اس خبر سے بے حد متاثر ہوئیں۔ ہفتوں کسی تقریب میں شریک نہیں ہوئیں بلکہ اُن کے تعلیمی مشن کو آگے بڑھانے کا عزم کیا۔

**1901**

4 جولائی کو گورنر جنرل کے نمائندے میجر ڈ کی موجودگی میں با قاعدہ رسم تاج پوشی ادا کی گئی اور ان کے شوہر احمد علی خاں کو احتشام الملک عالی جاہ کا خطاب ملا۔
17 جون بیگم سلطان جہاں کی فرماں روائی کا پہلا دن تھا۔

**1902**

یکم جنوری کی شب اچانک حرکتِ قلب بند ہو جانے سے ان کے شوہر نواب احمد علی خاں کا انتقال ہو گیا۔
22 جنوری کو ملکہ وکٹوریہ کا انتقال ہوا۔ انھیں اس خبر سے تکلیف پہنچی۔
3 مارچ کو وہ بذریعہ خط وائسرائے ہند سے حج بیت اللہ پر جانے کی اجازت طلب کرتی ہیں جس کے جواب میں کہا جاتا ہے کہ:

دربار تاج پوشی دہلی کے بعد تہیہ حج مناسب ہوگا،

فروری میں وزیرِ ریاست مولوی عبدالجبار خاں مستعفی ہو گئے۔

پنج سالہ مال گذاری کا نہ صرف معقول بندوبست کیا بلکہ زمینداروں اور کسانوں کو رعایت بھی دی گئی۔

**1903**

یکم جنوری کے جشن تاج پوشی کے بعد وہ پھر سفر حج کے لیے رخصت طلب کرتی ہیں، جو منظور ہوتی ہے۔
ریاست کے انتظامات بڑے بیٹے نواب نصر اللہ خاں کے سپرد کیے۔
اکتوبر میں حج کے لیے روانہ ہوئیں۔

**1904**

18 مارچ کو مکہ سے وطن کے لیے روانہ ہوئیں۔
مئی میں پرنس آف ویلز کے نام پر لیڈیز کلب کا سنگِ بنیاد رکھا۔
کنگ ایڈورڈ ہفتم نے جی۔سی۔آئی۔ای۔ (گریٹ نائٹ کمانڈر آف انڈین ایمپائر) کا خطاب عطا کیا۔

**1905**

پرنس آف ویلز کلب بن کر تیار ہوا۔
محکمۂ تعلیمات کے تحت ڈائرکٹر تعلیمات کا عہدہ قائم کرکے عبدالغفور شہباز کو پہلا ڈائرکٹر مقرر کیا۔ بعد میں اس عہدے پر عبدالرحمٰن بجنوری، سر راس مسعود، مفتی محمد انوار الحق فائز ہوئے۔

**1906**

ایجوکیشنل کانفرنس کے لیے علاحدہ دفتر بنوایا۔
دسمبر میں لارڈ منٹو، وائسرائے و گورنر جنرل سے ملاقات کی۔

**1907**

14 اگست کو بھوپال کے گرلس اسکول میں جلسۂ تقسیم انعامات کے موقع پر لڑکیوں کو

مخاطب کرتے ہوئے کہا:

''اس وقت تم بالکل ظلمات میں گھری ہوئی ہو۔ اے خاتونو! کوشش کرو، اور اپنے آپ کو ان ظلمات سے نکال لو، کیونکہ ظلمات سے نکلنے کے بعد ہی آبِ حیات ملتا ہے۔ اب وہ زمانہ تمھارے لیے بھی آ گیا ہے کہ آبِ حیواں جس سے مراد چشمۂ علم ہے، اپنی کوششوں سے حاصل کرلو اور مثلِ سکندر ذوالقرنین کے اس چشمۂ حیات کے کنارے پہنچ جاؤ۔ مگر یاد رکھو کہ آبِ حیواں دیکھا نہیں گیا۔ صرف اس کا نام سنا ہے، لیکن چشمۂ علم بلاشبہ آبِ حیات ہے کہ جس نے اسے پی لیا اس کا نام ہمیشہ دنیا میں زندہ رہتا ہے............ مذہب نے تم کو تعلیم کی ہدایت کی ہے۔ اور رسولِ برحق صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم میں عورتوں کو برابر کا حق دار بنایا گیا ہے لیکن تم اپنے اس حق سے محروم ہو اور تم نے اس کو کھو دیا ہے۔ حتیٰ کہ اب تمھاری حالت اس درجہ پہنچ گئی کہ تم یہ بھی نہیں جانتیں کہ تعلیم میں تمھارا حق بھی تھا یا نہیں......''

اپنی اس طویل تقریر میں وہ فرماتی ہیں:

''اے مسلمان خاتونو! تم میں سے ہر بیوی نے ضرور حضرت عائشہ صدیقہؓ، حضرت فاطمہؓ، حضرت سکینہؓ کا نام سنا ہوگا اور یہ بھی تم جانتی ہو کہ وہ اہل بیت رسالت میں سے تھیں مگر افسوس ہے کہ تم ان کے کمالات اور فضائلِ علمی سے واقف نہیں۔ تم یہ بھی جانتی ہو کہ مسلمانوں میں مسئلہ، مسائل اور حدیثیں بھی ہیں۔ مگر تم اس سے واقف نہیں کہ ان کے تم تک پہنچانے میں ان مقدس اور پاک بیوی نے کس قدر حصہ لیا ہے۔ ایسی بہت سے امیروں، بادشاہوں کی بیگمیں گزری ہیں جو مشہور و مدبر بادشاہوں کے برابر خردمند اور مستند تھیں۔ زبیدہ خاتون، نور جہاں بیگم، زیب النسا کے نام اور حالات تم نے سنے ہی ہوں گے اور اے ہندو

خاتونو! تمہاری قوم میں بھی اکثر قابل اور نامور عورتیں گزری ہیں۔ تم میں
سیتا جی۔ رانی لیلا وتی، رانی دمینتی کے قصے ہر زن و مرد کی زبان پر
ہیں..........''1

برجیسیہ کنیا پاٹھ شالا قائم کرتے ہوئے اُس کی اہمیت کو ان الفاظ میں اُجاگر کیا:

''اس سال ہندو لڑکیوں کے مفاد کے پیش نظر ایک خاص اسکول کھولا گیا
جن کا استحقاق میرے نزدیک ایسا ہی تھا جیسا ان کی مسلمان بہنوں کا۔
ہندوؤں کی مذہبی ضروریات، مسلمانوں کی مذہبی ضروریات سے کلی طور پر
مختلف ہیں اور مذہب سے بے بہرہ تعلیم میری نظروں میں ایک بے
وقعت چیز ہے..........میں نے یہ اسکول بطور نمونہ قائم کیا ہے۔''2

ماہ اکتوبر میں قدیم ''دفتر تاریخ'' کو جدید قالب میں تبدیل کروایا۔ محمد امین زبیری اس
کے مہتمم مقرر ہوئے۔

**1908**

پرنس آف ویلز لیڈیز کلب جو کافی دنوں پہلے بن کر تیار ہو گیا تھا، اس کا افتتاح لیڈی
منٹو کے ہاتھوں کروایا۔

**1909**

''لیڈی منٹو نرسنگ ہوم'' قائم کیا گیا۔
ایجوکیشنل کانفرنس کی توسیع کرائی گئی۔
13 دسمبر کو مدرسۂ سلطانیہ میں تقریر کی۔

''یاد رکھو تعلیم کا اصلی جز خدا ترسی و مذہب ہے اور جب تک مذہب
و خدا ترسی شامل نہ ہو تعلیم مثل گوہر بے آب کے ہے جس کی کوئی
قدر و قیمت نہیں ہوتی، مذہب کی آبیاری سے تعلیم کی جڑ مضبوط ہوتی ہے
اور وہی درخت بارآور ہوتا ہے جس کی جڑ مضبوط ہو۔ اس لیے تعلیم کے
عمدہ نتائج بھی اسی وقت حاصل ہو سکتے ہیں جبکہ تعلیم میں مذہب کی

آبیاری کی جائے۔ مذہب ادائے حقوق اور پابندی احکام شرعی وفرائض کی تاکید کرتا ہے۔ اس سے دل میں راست بازی ونیکی پیدا ہوتی ہے۔اس لیے میں نے تمھاری مذہبی تعلیم کومقدم رکھا ہے تاکہ تمام صفات انسانی کا کامل مجموعہ بن سکو'' 3

منجھلے صاحبزادے جنرل عبیداللہ خاں نے علی گڑھ میں لارڈ منٹو، وائسرائے کی یاد میں تعمیر ہونے والی عمارت کے لیے پچاس ہزارروپے بھجوائے۔

اپریل سے جولائی تک سروے کراتے ہوئے مال گزاری کا نیا انتظام کیا اور بقایات معاف کیے جس سے کسان بے حد خوش ہوگئے۔

برقی روشنی کا انتظام کیا گیا۔

بھوپال میں سنگِ سُرخ سے میوزیم کی عمارت تعمیر کرائی۔

1910

جنوری میں کنگ ایڈورڈ ہفتم نے جی۔سی۔ایس۔آئی۔(گرانڈ کمانڈر آف انڈین ایمپائر) کا خطاب عطا کیا۔

مسوری سے واپس ہوتے ہوئے M.A.O. کالج کے معائنہ کی غرض سے علی گڑھ تشریف لے گئیں۔

جون میں پرنس حمیداللہ خاں کا علی گڑھ میں داخلہ کرایا۔

1911

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تحریک شروع ہوئی تو پرنس آغا خاں اور وقار الملک ان کے پاس پہنچے۔بیگم صاحبہ نے نیک خواہشات اور دلی دعاؤں کے ساتھ فوری طور پر ایک لاکھ روپیہ عطا کیا۔

''ایک لاکھ اس وقت دیتی ہوں مگر کہے دیتی ہوں کہ اور بھی دوں گی۔اس کے علاوہ میں نے خود دیکھا ہے کہ علی گڑھ میں ہماری قوم کے بچے گرمی میں سخت تکلیف برداشت کرتے ہیں۔انھیں بجلی کی روشنی اور پنکھے بھی

دوں گی اور ریاست کے جاگیرداروں اور عمال سے بھی روپیہ دلواؤں گی۔
اگر ہز ہائینس نظام سے بھی ملاقات ہوگئی تو ان سے بھی مدد مانگوں
گی۔"4

5 دسمبر کو علی گڑھ میں تعلیم نسواں کے موضوع پر منعقد ہونے والے جلسے کی صدارت فرمائی۔
اپریل میں یورپ کا سفر کیا۔ وہاں کی درس گاہوں اور شفاخانوں کا معائنہ کیا۔
23 جون کو دربار لیوی میں شرکت کی اور کنگ جارج پنجم سے ملاقات کی جہاں انھیں تاج ہند کے خطاب سے سرفراز کیا گیا۔
مدرسۂ سلطانیہ کا لیڈی اُڈوائر نے معائنہ کیا اور حسنِ انتظام کی تعریف کی۔
"تزک سلطانی" شائع ہوئی۔

**1912**

پوتی برجیس جہاں بیگم کا انتقال ہوا۔
محترمہ نے دست کاری کی تربیت کے لیے قائم کیے گئے "بلقیسیہ کالج" کو وسعت دی بلکہ اس میں نرسنگ کی ٹریننگ بھی شروع کروائی۔
خواتین کی تعلیم وتربیت کے لیے ایک ٹرسٹ قائم کیا اور اس کے لیے چار لاکھ روپے مختص کیے اور تیرہ لاکھ سالانہ کا بجٹ تیار کرایا۔
اٹاوہ میں منعقد تعلیمی کانفرنس میں مدلل تقریر کی اور مدارس کو مالی امداد دی۔
غریب بچیوں کی نگہداشت کے لیے انفینٹ ہوم (Infant home) قائم کیا جس کا سنگِ بنیاد لیڈی ہارڈنگ نے رکھا۔
لاہور میں خواتین کے لیے سلطانیہ ہال قائم کیا۔
کتب خانہ کو از سرِ نو مرتب فرما کر ایک مستقل عملہ اور بجٹ معین فرمایا۔ شیخ محمد عبداللہ اور ان کی اہلیہ وحید جہاں بیگم کی خدمات کا اعتراف اور گرلس کالج سے متعلق اپنی خوشی کا اظہار فرمایا۔

**1913**

مارچ میں خواتین کی درخواست پر لاہور کا سفر کیا۔ ایک ہال کا سنگِ بنیاد رکھا جو محترمہ کے نام سے منسوب کیا گیا۔
دہلی میں کالج کی تعلیمی اصلاح پر منعقد ہونے والی کانفرنس میں شرکت کی۔
چار کتابیں (گوہر اقبال، ہدایات سلطانی، خطبات سلطانی، ڈومیسٹک اکونومی) شائع ہوئیں۔

**1914**

اسٹریچی ہال میں طلبا سے خطاب کیا۔
یکم مارچ کو مدرسۂ نسواں میں تقریر کی۔ جدید تعلیم نسواں پر دھیان دلایا۔ بچیوں کے لیے سلطانیہ اسکول کا افتتاح کیا، اور ان کے لیے سلطانیہ بورڈنگ ہاؤس کا سنگِ بنیاد رکھا (تقریب کی مکمل روداد رسالہ ''خاتون'' علی گڑھ۔ فروری، مارچ 1914 میں درج ہے۔)
27 فروری کو آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی عمارت کی بنیاد رکھی جو سلطان جہاں کے نام سے مشہور ہے۔
28 فروری کو اسٹریچی ہال میں ٹرسٹیان محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کو خطاب کیا۔
زنانہ مصنوعات کی نمائش کا بڑے پیمانے پر اہتمام کیا۔
پہلی جنگِ عظیم کے شروع ہوتے ہی بیگم صاحبہ نے سلطنتِ برطانیہ کے لیے ہر قسم کی مدد کا جتن کیا۔
''اختر اقبال'' اور ''حیات شاہجہانی'' شائع ہوئیں۔

**1915**

شمشاد مارکیٹ علی گڑھ میں سلطان جہاں منزل کی تعمیر شروع کروائی۔
اپنی چھوٹی بیٹی آصف جہاں بیگم کی یاد میں آصفیہ ٹیکنیکل اسکول قائم کیا۔
پرنس حمید اللہ خاں نے بی۔ اے۔ پاس کیا۔

تعلیم نسواں کی بہتری کے لیے اناوہ میں جو نصاب تیار کیا گیا تھا اس پر مشورے دیے۔
''تذکرۂ باقی'' اور ''ہدیۃ الزوجین'' شائع ہوئیں۔

**1916**

جنوری میں خواتین کی دستکاری کی چیزوں کی نمائش کے لیے مینا بازار قائم کیا گیا۔
پانچ کتابیں (تندرستی، حفظانِ صحت، معیشت خانہ داری، معاشرت کا ذکر مبارک، بِٹنگ) شائع ہوئیں۔
5 فروری کو علی گڑھ میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی عمارت کا افتتاح کیا جو سلطان جہاں منزل کے نام سے مشہور ہوئی (30 ہزار بیگم صاحبہ نے اور 18 ہزار شہزادگان نے دیے تھے) دفتر کے اخراجات کے لیے دو ہزار سالانہ کی مستقل امداد منظور کی۔
بڑے تالاب میں یاٹ کلب کی بنیاد ڈالی گئی اور کشتیوں کی دوڑ کے لیے ایک عمارت تعمیر کرائی گئی۔

**1917**

لیڈیز کلب میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

''میں تعلیم کے ساتھ اس آزادی کو پسند نہیں کرتی جو اعتدال سے تجاوز ہو چکی ہے۔۔۔ ممکن ہے کہ یہ آزادی جو سرزمین یورپ میں ہے وہاں کے لیے مناسب ہو یا یہ آزادی مذہب عیسوی کی تلقین و ہدایت کے مطابق ہو۔ مگر ہندوستان اور بالخصوص مسلمانوں کے لیے کسی طرح اور کسی زمانہ میں، میرے خیال میں موزوں نہ ہوگی اور نہ خدا تعالیٰ کے احکام کبھی غیر مفید ہو سکتے ہیں۔ پس ہم کو اس مقولہ پر عمل کرنا چاہیے ''**خذ ما صفا ودع ما کدر**'' اچھی چیزوں کو لے لو اور بری چیزوں کو چھوڑ دو۔''

''عمدہ سوسائٹی ہمیشہ انسانی اخلاق کو جلا دیتی ہے اور اگر اسی کے ساتھ تعلیم

بھی ہو تو نورٌ علیٰ نور ہو جاتی ہے۔ میں خود محسوس کرتی ہوں کہ اس کلب نے آپ کے گروہ میں ایک عظیم تغیر پیدا کر دیا ہے اور مجھے کوئی شبہ نہیں ہے کہ خواہ رفتارِ ترقی تیز نہ ہو لیکن اس سے ایک حد تک تو وہ اغراض پورے ہو رہے ہیں جو اس کے قائم کرتے وقت قرار دیے گئے تھے۔ اس بات کو کبھی نہیں بھولنا چاہیے کہ کلب اور سوسائٹیاں عموماً کسی اصلاح یا ترقی یا کسی اور عمدہ مقصد کے لیے قائم کی جاتی ہیں اور وہ عموماً شریفانہ مقصد ہوتے ہیں لیکن اگر اس کو نمود و نمائش فیشن و خود بینی کا مرکز بنالیا جائے تو وہ مقاصد پورے نہیں ہوتے بلکہ برعکس نتائج نکلتے ہیں۔''

جارج پنجم نے فوجی اعزاز جی۔ بیل۔ ای۔ تفویض کیا۔

لیڈی چیمسفورڈ کی درخواست پر لیڈیز فارن اگزیکیٹو کمیٹی کی وائس پریسیڈنٹ کا عہدہ قبول کیا۔

جنگ عظیم کے زخمیوں کی امداد کے لیے دیگر سامان کے ساتھ مدرسۂ سلطانیہ کی لڑکیوں کے بنائے ہوئے سامان سے تیرہ سو روپے چندے کے بھجوائے۔

حیات قدسی اور سبیل الجنان شائع ہوئیں۔

**1918**

طب یونانی کی جدید تعلیم کے لیے مدرسۂ طبیہ آصفیہ اور اس کا بے حد وسیع شفاخانہ بنوایا۔

ایک جدید نصاب عام مدارس نسواں کے لیے بذات خود تیار کیا اور اس کو ریاست سے باہر ماہر تعلیم کو بغرض تبصرہ وتنقید روانہ کیا۔

لیڈی چیمسفورڈ نے مدرسۂ سلطانیہ کا معائنہ کیا۔

عبدالرحمٰن بجنوری کے انتقال کی خبر سن کر افسوس ہوا اور کہا کہ غربا کا خیال رکھنے والا ایک ادیب اُٹھ گیا۔

خواتین کی تعلیم و تربیت پر تبادلۂ خیال اور غور و بحث کے لیے 26 سے 29 مارچ تک ایوان صدر منزل (بھوپال) میں آل انڈیا لیڈیز ایسوسی ایشن کے اجلاس ہوتے

رہے۔ بیگم صاحبہ نے نہ صرف صدارتی خطبہ پیش کیا بلکہ تیرہ لاکھ روپے سے ''سلطان جہاں ویمنس ٹرسٹ'' قائم کیا۔
اپریل میں امپیریل کونسل کے ممبروں اور والیانِ ملک کے جلسہ میں شرکت کی اور مہاراجہ بڑودہ کے ریزولیشن کی تائید میں تقریر کی۔
سیرت کا پہلا حصہ مکمل ہونے پر سید سلیمان ندوی نے اسے بیگم صاحبہ کو پیش کیا جنھوں نے ان کی دیگر کتابوں کی اشاعت کے لیے تین ہزار روپے تفویض فرمائے۔
روضۃ الریاحین اور عفت المسلمات شائع ہوئیں۔

**1919**

لازمی تعلیم کے لیے جبریہ قانون نافذ کیا جو بے حد کامیاب رہا۔
30 جون کو لارڈ چیمسفورڈ کے خریطۂ شکریہ کا جواب دیا۔
15 اکتوبر کو سیہور کا علاقہ انگریزوں سے شکریے کے ساتھ انھیں واپس ملا۔
سِلکِ شہوار شائع ہوئی۔

**1920**

14 ستمبر کو ایم۔ اے۔ او۔ کالج، علی گڑھ کو یونیورسٹی کا درجہ ملا۔ یکم دسمبر کو ایکٹ کے ذریعے مسلم یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔
وائسرائے گورنر جنرل ہند نے 25 دسمبر کو بیگم سلطان جہاں کو چانسلر مقرر کیے جانے کا اعلان کیا۔
''مقصدِ ازدواج'' اور ''سیرت مصطفیٰ'' شائع ہوئیں۔

**1921**

تمام شہروں میں بجلی کا معقول بندوبست کیا گیا۔
''فرائض النساء'' اور ''بچوں کی پرورش'' شائع ہوئیں۔

**1922**

علی گڑھ 28 دسمبر جلسۂ تقسیم اسناد کے فرائض انجام دیے اور پُر مغز تقریر کی۔

نظام حکومت میں تبدیلی کرتے ہوئے کچھ جدید اضافے کیے۔
مئی میں اسٹیٹ کونسل کا افتتاح کیا۔
''رہبر نسواں'' اور ''اسلامیات'' شائع ہوئیں۔

1923

فوری طبی سہولت کے لیے سینٹ جان ایمبولینس کی خدمات کو سراہتے ہوئے اسے انڈین برانچ میں شامل کیا اور وائسرائے نے بطور اظہار خوشنودی اپنا دستخطی سرٹیفکیٹ عنایت کیا۔
لارڈ ریڈنگ نے ہائی کورٹ کا افتتاح کیا۔
''فرائض وہدایات باغبانی'' شائع ہوئی۔

1924

24 مارچ کو منجھلے بیٹے حافظ حاجی جنرل نواب محمد عبید اللہ خاں کا 46 برس کی عمر میں انتقال ہوا۔
3 ستمبر کو بڑے بیٹے ولی عہد نواب محمد نصر اللہ خاں کا انتقال ہو گیا۔
''اخلاق کی پہلی دوسری کتاب'' منظر عام پر آئی۔

1925

لندن میں کنگ جارج پنجم سے ملاقات کر کے اے ایم یو کے کانووکیشن میں تشریف لائیں۔ 175 مہمانوں کے قیام کے لیے کاریں مہیا کرائیں اور خیموں کا بھی انتظام کرایا۔
اپنے دورِ فرماں روائی میں آخری بجٹ پیش کیا جو =/62,91,574 روپے چودہ آنے، ڈیڑھ پائی کا تھا اور آمدنی =/58,39,210 روپے پندرہ آنے کا تھا۔
ولی عہد ریاست محمد نصر اللہ خاں کا انتقال ہو گیا تو ان کی یاد میں ہوسٹل تعمیر کرانے کے لیے اسی ہزار روپے، نصابِ تعلیم نسواں کے لیے دس ہزار، لائبریری کے لیے دس ہزار، اور مدرسۂ نسواں کے لیے بیس ہزار روپے مرحمت فرمائے۔
''درسِ حیات'' اور ''اخلاق کی تیسری و چوتھی کتاب'' کی اشاعت ہوئی۔

1926

17 مئی کو تخت وتاج سے دستبردار ہونے کا لندن میں منصوبہ بنایا اور دو دن بعد چھوٹے بیٹے کو حکومت سونپنے کا اعلان کر دیا۔

پوتی صاحبزادی عابدہ سلطان کو ولی عہد قرار دلوایا۔

9 جون کو صدر منزل میں باضابطہ نواب حمید اللہ خاں کی صدر نشینی کی رسم ادا کی گئی۔

اپنے مرحوم بیٹے نصر اللہ خاں کی یاد میں تعمیر نصر اللہ ہوسٹل (وی۔ ایم۔ ہال، علی گڑھ) کے لیے اسی ہزار روپے مرحمت فرمائے۔ افتتاحی تقریر میں کہا:

''اینٹ، گارے، چونے اور پتھر کی رفیع الشان عمارتیں بلاشبہ جاذبِ نظر ہوتی ہیں لیکن اُن کی حقیقی شان اُس وقت نمایاں ہوتی ہے جب اُن کے اندر کیے گئے کام کے شاندار نتائج ظاہر ہوں۔ دُنیا کی کوئی عمارت حجرۂ نبوی کی خام دیوار اور نیچی چھت سے زیادہ شاندار نہیں۔ یہ وہ مقدس عمارت تھی جہاں سے علم وفضل کے دریا موجزن ہوئے اور اُن سے وہ برقی قوت حاصل ہوئی کہ بحر و بر منور ہو گئے۔''

''میں اپنی قوم کی اقتصادی حالت سے بخوبی واقف ہوں اور یہ بات بھی جانتی ہوں کہ تعلیمی اخراجات روز بروز بڑھتے جا رہے ہیں اور محض اسی وجہ سے ہماری قوم کے بہت سے بہترین دماغ نشو ونما حاصل کرنے سے محروم رہ جاتے ہیں اور یہ ایک ایسا قومی نقصان ہے جو مسلسل طور پر جاری وساری ہے اس لیے جن لوگوں کو منعمِ حقیقی نے دولت وثروت دی ہے ان کا فرض ہے کہ مختلف شکلوں سے اس نقصان کی تلافی کے لیے فیاضی سے کام لیں۔''

نومبر میں جلسہ تقسیم اسناد میں شرکت کی۔ شعبہ سائنس، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو دو لاکھ روپے عطا کیے۔

31 دسمبر کو صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے وائس چانسلر کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ بیگم صاحبہ کو اس اطلاع سے تکلیف پہنچی۔
صاحبزادہ آفتاب احمد خاں اور ڈاکٹر سر ضیاء الدین کے مابین پیدا ہونے والے اختلافات کے تعلق سے وائسرائے نے بیگم صاحبہ کو یونیورسٹی کے کل معاملات کی انکوائری کروانے کے لیے ایک کمیشن مقرر کرنے کا مشورہ دیا۔ اگست میں سر ابراہیم رحمت اللہ خاں کی صدارت میں ایک کمیشن کا قیام عمل میں آیا جس نے دو ماہ میں تفتیش مکمل کر کے نواب سلطان جہاں بیگم کو رپورٹ پیش کی۔
''باغ عجیب'' کے دو حصے منظر عام پر آئے۔

**1927**

5 فروری کو خواتین کے عظیم الشان جلسہ میں تقریر کی اور مدرسۂ اسلامیہ حمیدیہ کا افتتاح کیا۔
8 ستمبر کو لڑکیوں کی ثانوی تعلیم کے لیے ایک الگ ونگ بنوائی۔
طب یونانی کی سرپرستی کے لیے جلسۂ تقسیم اسناد کے موقع پر مالی امداد فرمائی۔
جامعہ ملیہ کا غیر رسمی طور پر معائنہ کیا۔ اس کے نصاب و طریق تعلیم سے مطمئن ہو کر فرمایا:

> ''جامعہ کے حالات سن کر مجھے بہت خوشی حاصل ہوئی۔ آپ لوگوں نے مسلمانوں کے تنزل کے اصلی اسباب کو سمجھ لیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ اسلام کے بجھتے ہوئے چراغ کو دوبارہ روشن کریں گے۔'' 5

**1928**

صاحبزادی عابدہ سلطان کو ولی عہد قرار دلوایا۔
آخری بار نمائش مصنوعات خواتین ہند میں شرکت کی۔ انعامات تقسیم کیے۔
دہلی میں آل انڈیا ویمنس کانفرنس کی صدارت کی۔
''تربیت الاطفال'' اور ''ہدیۃ الزوجین'' شائع ہوئیں۔

**1929**

2 فروری کو آخری مرتبہ علی گڑھ تشریف لائیں اور کورٹ کے سالانہ جلسہ کی صدارت کی۔

**1930**

12 مئی کی صبح پتے میں پتھری کا آپریشن کرایا۔ دیر رات انتقال ہو گیا۔
''حیات سکندری'' منظرِ عام پر آئی۔

---

1: بحوالہ، دُرِ شہوار، ص۔4 تا 12
2: ایضاً ، ص13،
3: تقریر مدرسہ سلطانیہ، 13 دسمبر 1909
4: رضیہ حامد، ص، 28، اطہر صدیقی۔
5: حیاتِ سلطانی، مولف محمد امین زبیری، ص، 145-144

# جامع انتخاب

**خطاب**

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے تیسرے کانووکیشن منعقدہ 26 جنوری 1925 کے موقعہ پر بیگم سلطان جہاں کا خطاب:

| | | |
|---|---|---|
| وائس چانسلر | : | صاحب زادہ آفتاب احمد خاں |
| صدرِ جلسہ | : | سلطان جہاں بیگم والی بھوپال<br>و چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ |
| پیشکش سالانہ روداد | : | ڈاکٹر سر ضیاء الدین<br>پرو وائس چانسلر، اے ایم یو، علی گڑھ |
| اعزازی ڈگری | : | سید امیر علی، ڈی لٹ<br>سر ہرکورٹ بٹلر گورنر آف برما م ڈی۔ لٹ۔ |

نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ نے حسبِ ذیل خطبہ ارشاد فرمایا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وائس چانسلر، اعیانِ یونیورسٹی، معززین و خواتین،

آج جبکہ ہم سب اس دار العلوم میں اس کی سالانہ علمی تقریب کے موقعے پر جمع ہیں تو ہم کو

بے اختیار اس کا دور اولین یاد آتا ہے، جبکہ اس جلیل القدر مدبر اور نامور فاضل ہز اکسیلینسی لارڈ لٹن نے سچی ہمدردی اور حقیقی دلچسپی کے ساتھ ملکہ وکٹوریہ عظمیٰ قیصرۂ ہند کے نائب السلطنت کی حیثیت سے ایک چھوٹے سے شامیانے کے نیچے اس دار العلوم کا سنگِ بنیاد رکھ کر ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیم جدید کی بنا ڈالنے میں امداد کی تھی۔ اب وہ دور اول، ترقی کے بہت سے مدارج طے کر کے ختم ہو چکا ہے اور دوسرا دور شروع ہوا ہے۔ یعنی وہ ابتدائی مدرسہ کالج کی حد سے نکل کر یونیورسٹی بن گیا ہے۔ اس وقت یہاں پر ہز اکسیلنسی لارڈ ریڈنگ کی تشریف آوری اور اس تعلیم گاہ سے جناب ممدوح کی دلچسپی اور ہمدردی جس کا ابھی دو گھنٹے قبل ہم سب نے نہایت دلچسپ نظارہ کیا ہے یقیناً ہماری یونیورسٹی کے لیے ایک نہایت نیک فال ہے اور ہم کو یقین ہے کہ اس سے اس یونیورسٹی کی ایسی ہی زرّیں روایات کی ابتدا ہوگی، جس طرح آج سے پچاس سال قبل لارڈ لٹن کی تشریف آوری ہمارے کالج کی شاندار روایات کا سنگ بنیاد ہوئی تھی اور جو ہمیشہ احسان مندی اور شکر گزاری کے ساتھ ہماری قوم کی تعلیمی تاریخ میں نمایاں رہے گی۔

ہماری یونیورسٹی اگرچہ ابھی اپنے ابتدائی درجے میں ہے اور ہم کو قدم قدم پر مشکلات کا سامنا ہوتا ہے تاہم اس کی روز افزوں وسعت اور اس کی رفتارِ ترقی مستقبل کے لیے بہت کچھ امید افزا ہے۔ کیونکہ گو اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ ہر عظیم الشان کام کی ابتدا مشکلات سے معمور ہوتی ہے بلکہ اس کی عظمت کا معیار ہی اس کی مشکلات کی کثرت ہے۔ لیکن سچے دل سے کام کرنے والوں کی سعی و ہمت ہمیشہ ان مشکلات پر غالب آ جاتی ہے اور اسی وجہ سے ان کی یہ کامیابی آئندہ نسلوں کے لیے باعثِ فخر ہو جاتی ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے۔

بیا بگزر کہ از بہرِ گزشتنہاست جاہا

البتہ یہ درست ہے کہ موقع جس قدر نازک اور مشکل جتنی زیادہ سخت ہوگی کام کرنے والوں کو اسی قدر زیادہ حزم و احتیاط اور خلوص وایثار سے کام کرنا ہوگا۔ یہی کامیابی کا اصلی راز ہے اور مجھے یقین ہے کہ ہماری یونیورسٹی میں بھی اسے ہمیشہ پیش نظر رکھا جائے گا۔

لیکن کسی دار العلوم کی کامیابی کا معیار محض اس کے شرکا کے امتحان کی کثرت یا اس کی عمارتوں کی وسعت و شوکت نہیں ہے بلکہ ہماری تمام جدو جہد کا مقصد اصلی یہ ہونا چاہیے کہ ہم ایسا ماحول

بنائیں اور ایسی فضا پیدا کریں کہ ہمارا دارالعلوم حقیقی طور پر علم وفضل کا گھر بن جائے اور اس کے طلبہ صحیح معنوں میں طالبانِ علم ہوں اور ان کا اخلاق ایسے سانچے میں ڈھلا ہوا ہو کہ جب وہ زندگی کے عملی میدان کارزار میں داخل ہوں تو اہلِ کمال کے حلقوں میں اپنے لیے ممتاز جگہ حاصل کرسکیں اور ملک وقوم کے بہترین خدمت گزار بن سکیں۔ مگر یہ منشا و مدعا اس کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ ان کے استادان کے سامنے علمی، اخلاقی اور روحانی زندگی کا ایسا نمونہ پیش کریں جو ان کا بہترین نصب العین ہو اور وہ اس نصب العین کو اپنا مطمح نظر بنا کر ہمیشہ ایسے مشاغل علمیہ میں منہمک رہیں جو ان کے دل میں حصول علم کا سچا اور دائمی ذوق وشوق پیدا کریں۔

یورپ کی گوناگوں ترقیاں جو اہل مشرق کو ششدر کیے ہوئے ہیں دراصل وہاں کی یونیورسٹیوں ہی کی رہینِ منت ہیں اور ان کے عروج کا تمام راز ان ہی درسگاہوں کے طریق کار میں مضمر ہے کیونکہ یہیں کے طلبا ہیں جنھوں نے اپنی علمی قابلیتوں اور دماغی قوتوں سے اپنے ملکوں کے لیے ایک طرف تو روئے زمین کو مسخر کرلیا ہے اور دوسری طرف قدرت کی غیر محدود طاقتوں کو اپنا مطیع اور فرماں بردار بنا دیا ہے۔

ہماری گزشتہ پنج سالہ کوششوں کا منشا و مدعا زیادہ تر یہی تھا کہ ابنائے قوم کو ان کی عام غفلت و جمود کی حالت سے بیدار کر کے ان کو تعلیم جدید کی جانب راغب اور متوجہ کیا جائے۔ الحمد للہ وہ مقصد تو ایک حد تک حاصل ہو گیا لیکن اب اس کے بجائے ہمارا مقصد اولین یہ ہونا چاہیے کہ یہ دارالعلوم جس کا تمام نظم ونسق خود ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ ہمارے نونہالانِ قوم ووطن کا بہترین دماغی اور اخلاقی تربیت گاہ بن جائے۔ تاکہ وہ جب یہاں سے نکلیں تو ہر قسم کے زیور فضل وکمال سے آراستہ ہو کر نکلیں اور اپنے ملک اور اپنی قوم کی فلاح و بہبود میں پورا حصہ لے سکیں، کیونکہ اگر یہ نہ ہو تو خواہ ہمارے یہاں سے ہر سال ہزاروں طلبہ ڈگریاں لے کر نکلیں تب بھی حقیقت میں وہ تمام کوششیں جو ان کی تعلیم میں کی گئی ہیں بلا شبہ سعی نامشکور ہوں گی۔

حضرات! بلا شبہ یونیورسٹی کی ترقی اور وسعت کے متعلق ہماری تمنائیں بھی بہت وسیع ہیں لیکن ان کے پورا ہونے کے لیے یہ شرط لازم ہے کہ اس دارالعلوم کے تمام موجودہ شعبہ ہائے تعلیم ہر حیثیت سے کامل اور مکمل ہوں اور ان کے تمام مضامین درس وتدریس کا انتظام بہترین اسلوب

پر ہو۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس کا تمام تر دارومدار یونیورسٹی کی مالی خوشحالی پر ہے اور مجھے افسوس ہے کہ وہ ابھی تک کسی طرح بھی قابل اطمینان نہیں کہی جا سکتی۔ کیونکہ ابھی تو اس کی موجودہ آمدنی اس کے معمولی مصارف کے لیے ہی مکتفی نہیں ہے چہ جائے کہ اس میں مختلف مزید ضروریات کا انتظام کیا جا سکے جن کے لیے کئی لاکھ روپیہ سالانہ کی مزید مستقل آمدنی ہونی چاہیے۔ ان ضروریات کی مفصل کیفیت آپ کو جداگانہ رپورٹ سے معلوم ہوگی۔

صاحبان! دنیا کی سب سے بڑی حکمراں اور دولتمند قوموں کی یونیورسٹیاں بھی سلطنتوں کی امداد سے زیادہ اپنے ارباب ہمت افراد کی جود وسخا کی ممنون احسان ہیں۔ تو پھر ایک ہم جیسی کم مایہ قوم کی قومی تعلیم گاہ کو اس میں کیا عار ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے قیام و بقا کے لیے اپنے صاحب دولت وثروت فرزندوں کے سامنے دست سوال دراز کرے اور ان کو اپنی اعانت و امداد کی طرف توجہ دلائے۔

آج کل اعلیٰ تعلیم اور بالخصوص صنعت وحرفت اور شعبہ ہائے سائنس کی تعلیم کے لیے نہایت بیش قرار مصارف ناگزیر ہیں اور اس کی ملک اور قوم کو سب سے زیادہ ضرورت ہے اس لیے غالباً میرا یہ کہنا کچھ بے جا نہ ہوگا کہ ہمارا یہ ایک قومی فرض ہے کہ ہم اپنے اس واحد تعلیمی مرکز میں اس کا کافی اور قابل اطمینان انتظام کرنے کے لیے بہ قدر امکان پوری کوشش کریں۔ اگر خلوص کے ساتھ جدو جہد کی جائے تو یہ کچھ ایسا بہت مشکل کام نہیں ہے کیونکہ اول تو اب علی العموم مسلمان اس تعلیم کی ضرورتوں سے اتنے بے خبر نہیں رہے ہیں جیسے کہ وہ پہلے تھے۔ دوسرے خود اس دارالعلوم کے فرزندان معنوی کی تعداد ہزاروں سے گزر چکی ہے اور ملک کا کوئی حصہ اور کوئی کونا ایسا نہیں ہے جہاں اس کے نام لیوا موجود نہ ہوں اس لیے اب اس وقت اس کے لیے لاکھوں کا سرمایہ فراہم کر لینا اس وقت کے ہزاروں سے بھی زیادہ آسان ہے جبکہ سرسید مرحوم نے اس کے اجرا کا اعلان کیا تھا اور ہر چہار جانب سے اس پر لعن وطعن کی بوچھار ہو رہی تھی۔

بہر حال اس وقت ہمارے سامنے یہ سوال ہے کہ کیا ہندوستان کے آٹھ کروڑ مسلمان اپنے ایک مرکزی قومی تعلیم گاہ کی ضرورتوں کو بھی پورا نہیں کر سکتے؟ نہیں وہ ضرور کر سکتے ہیں۔ بشرطیکہ ان کو ان ضرورتوں کا علم اور احساس ہو جائے۔ انھوں نے اپنے مذہب اور اپنی قوم کے لیے اپنی

حسب حیثیت بہت کچھ فیاضیاں کی ہیں۔ چنانچہ یہ دار العلوم خود ہی ان کی فیاضی کی ایک مجسم زندہ مثال ہے اور یہ امر کچھ کم مسرت بخش نہیں کہ اس کی تاریخ میں جہاں والیان ملک، امراو تجار کے گراں قدر عطیے نظر آتے ہیں وہاں غربا اور متوسط طبقوں کی مخلصانہ امدادیں بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ اس لیے ہم کو آئندہ کے لیے ناامید ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

صاحبان!

آپ ذرا دیر کے لیے اپنی چشم تصور سے پچاس سال پہلے کا وہ منظر دیکھیے جبکہ اس تعلیم گاہ کی ابتدا سات طالب علموں سے مٹی اور پھونس کے بنگلوں میں کی گئی تھی۔ اور پھر آنکھ کھول کر اس موجودہ دار العلوم پر نظر ڈالیے اور اس کی شاندار عمارات، قیمتی ساز و سامان مسلم اور مستند قابلیت کے استاد اور کثیر التعداد طلبہ کو ملاحظہ کیجیے تو آپ کو اچھی طرح اندازہ ہو جائے گا کہ آپ کی غریب اور مفلس قوم نے کیا کیا کیا ہے اور کیا کیا کر سکتی ہے۔ قوم کے سامنے اس ترقی کا زیادہ صحیح اور واضح نقشہ پیش کرنے کے لیے کارکنان دار العلوم عنقریب اس کی پنجاہ سالہ جوبلی کا جشن کرنے والے ہیں جو امید ہے کہ بجائے خود ایک سبق آموز اور نتیجہ خیز تاریخی یادگار ہوگی۔

لیکن صاحبان! اس کے ساتھ ہی آپ کو اپنے ان بزرگوں اور محسنوں کی مخلصانہ کوشش اور بے غرضانہ سعی کا بھی خیال کرنا چاہیے جن کی شبانہ روز کی پیہم تگ و دو سے قوم میں یہ احساس پیدا ہوا جس کے دل خوش کن نتیجوں پر ہم خوشیاں منا رہے ہیں۔ کیونکہ یہ یقینی امر ہے کہ جب تک ان ہی کے نقش قدم پر چل کر پورے خلوص اور سچے ایثار سے جدوجہد نہ کی جائے گی کامیابی مشکل ہے۔

بہر حال یہ امر موجب اطمینان ہے کہ جہاں تک وسائل اجازت دیتے ہیں یونیورسٹی میں جدید شعبے قائم ہوتے جاتے ہیں۔ چنانچہ تعلیم المعلمین 1 کا شعبہ قائم ہو گیا ہے اور علم حیوانات 2 و نباتات 3 کا بھی انتظام کر دیا گیا ہے لیکن ان کے سوا دیگر علوم سائنس کا بندوبست ہونا باقی ہے۔ اگرچہ یہ کمی سخت افسوس کے قابل ہے۔ لیکن اس کی وجہ وہی مالی مشکلات ہیں جن کا ابھی میں نے سرسری طور پر ذکر کیا ہے۔ اور جب تک وہ حل نہ ہو جائیں کارکنان دار العلوم معذور ہیں اور ان کو اس کا جواب دہ نہیں ٹھہرایا جا سکتا تاہم اس کی جانب سے تغافل یا تساہل ان پر بالخصوص اور تمام قوم پر بالعموم ایک بدنما دھبہ ہے جس کو جلد سے جلد مٹانے کی کوشش ہونی چاہیے ورنہ آئندہ نسلیں

حاکم حقیقی کی بارگاہ میں ہماری دامنگیر ہوں گی۔

اس یونیورسٹی کے قیام میں یونیورسٹی کے بانیوں کا یہ مقصد بھی شامل رہا ہے کہ السنۂ مشرق کی تعلیم و تعلم کا زیادہ بہتر انتظام کیا جا سکے اور ان کی جانب سے مسلمانوں کی روز افزوں بے اعتنائی کا سدِ باب ہو سکے۔ یقیناً یہ مقصد نہایت اہم اور قابلِ قدر ہے اور اسے ایک لحہ کے لیے بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ ہمارا تمدن، ہماری معاشرت، ہماری تہذیب اور ہمارا مذہب ہماری قومی زبانوں کے ساتھ وابستہ ہے اور اگر ہم اس کو بھول گئے تو چند دن بعد یقیناً ہم ان کو بھی کھو بیٹھیں گے اس لیے السنۂ مشرقیہ اور بالخصوص عربی فارسی کی اعلیٰ اور بہتر تعلیم پر یونیورسٹی کی اکاڈمک (تعلیمی) کونسل کو زیادہ توجہ مبذول کرنی چاہیے۔ یہ امر باعث مسرت ہے کہ شعبۂ سنسکرت کے اجرا سے ہمارے دار العلوم کی یہ ایک بدنما کمی پوری ہوگئی ہے۔

زنانہ تعلیم کے متعلق بھی ہمارے دار العلوم کو ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے اگر چہ مدرسۂ نسواں علی گڑھ کو ملحق کر لیا گیا ہے لیکن تعین و انتخاب نصاب کا اصلی کام ابھی توجہ کا محتاج ہے اور جب تک وہ طے نہ ہو جائے تب تک سمجھنا چاہیے کہ اس دشوار گذار راستہ کی پہلی منزل بھی طے نہیں ہوئی۔ یہ سچ ہے کہ بی اے کے کامیاب طلبہ کی فہرست میں ایک مسلمان خاتون کا نام دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی لیکن اس کا سبب صرف اس کی ندرت و نایابی ہے کیونکہ علم و کمال کے میدان میں عورتوں کا مردوں کے دوش بدوش چلنا ہمارے لیے کچھ عجیب اور غیر معمولی بات نہیں ہے۔ ہمارے مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے شروع ہی سے نوع انسان کی ان دونوں صنفوں کو ان کی قلبی، دماغی اور روحانی قابلیتوں کے لحاظ سے ہر معاملہ میں بالکل برابر رکھا ہے اور ہماری تاریخ کے صفحے صنفِ ضعیف کے مردانہ کارناموں سے بھرے پڑے ہیں۔ اب البتہ اس عام پستی اور انحطاط کے دور میں ایسی مثالیں کمیاب ہوگئی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اعلیٰ تعلیم یافتگان کے زمرہ میں ایک مسلم خاتون کا نام موجب استعجاب معلوم ہوتا ہے۔ اگر چہ حقیقت یہ ہے کہ یہ استعجاب تعلیم اناث کی جانب سے خود ہمارے طبقہ مذکور کی لاپروائی اور غفلت کی دلیل ہے لیکن صاحبان! میرے نزدیک اس ایک لڑکی یا بالفرض بہت سی لڑکیوں کے بھی بی اے ہو جانے سے اصل مسئلہ حل نہیں ہوتا ابھی تک تو ہمارے ملک کے ارباب رائے اس پر متفق نہیں ہیں کہ یہ موجودہ طرز تعلیم و امتحان ہمارے لڑکوں کے لیے

کہاں تک مفید ہے تو پھر کیوں کر اطمینان سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ ہماری لڑکیوں کے لیے بلا اختلاف مفید ہوگا جبکہ یہ بھی تسلیم کیا جاتا ہے کہ ہماری معاشرت میں دونوں فرقوں کے دائرۂ عمل الگ الگ اوران کی ضروریات زندگی جدا جدا ہیں۔

میں نے پہلے بھی کہا تھا اور اب پھر اس کو دوہراتی ہوں کہ اس خاص شعبے میں دیگر اقوام کی تقلید میں اپنی خاص معاشرتی خصوصیات اور قومی روایات سے انحراف کسی طرح روا نہ رکھا جائے۔ بہر حال اس کا تعلق مسئلہ تعین نصاب سے ہے اور اس کی ضرورت اور اہمیت پر میں اوپر کافی زور دے چکی ہوں۔

صاحبان! یہ اور اسی قسم کی اور خامیاں تو خیر امید ہے کہ انشاءاللہ رفتہ رفتہ دور ہو ہی جائیں گی لیکن جو کمی مجھے سب سے زیادہ محسوس ہوتی ہے وہ شعبۂ علوم اسلامیہ (اسلامک اسٹڈیز) کی ہے کیونکہ اس کی حالت تو یہ ہے کہ شعبہ شروع سے قائم اور موجود ہے لیکن اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہی وہ شعبہ ہے جس کے تذکرے کے ہر اک خانہ میں اول سے آخر تک صفر ہے۔ کیا یہ کیفیت سبق آموز نہیں ہے؟ کہا جاتا ہے کہ اب اس کا نصاب مرتب ہو گیا ہے مگر اس کے بعد اس میں اللہ کا نام ہے۔ مسلم دارالعلوم میں اسلامی علوم کی طرف سے یہ لا پروائی قابلِ افسوس ہے۔ اس سے تو یہ بدرجہا بہتر ہوتا کہ اس کا نام ہی نہ ہوتا تا کہ یہ انگشت نمائی تو نہ ہوتی بہر حال مجھے یقین ہے کہ کارکنانِ دارالعلوم اس کی جانب خاص توجہ کریں گے۔

صاحبان! اب میں چاہتی ہوں کہ ان نونہالانِ قوم سے جنھوں نے اپنی قومی درس گاہ کی ڈگریاں حاصل کی ہیں اور جو اس حصول مقصد میں سرگرم محنت ہیں چند باتیں کہوں ـــــ

عزیزانِ من! اس موقع پر طلبا سے خطاب کرنا ایک رسمی بات ہے لیکن میں تم کو یقین دلاتی ہوں کہ میرا مقصود محض کسی رسم کا ادا کرنا نہیں ہے بلکہ میں اس فرض کو پورا کرنا چاہتی ہوں جو ایک ایسے فردِ قوم پر عائد ہوتا ہے جس کو اپنی قوم کی تعلیمی ترقی سے حقیقی دل بستگی ہے۔

تم اب یونیورسٹی کے محدود دائرہ سے نکل کر زندگی کے غیر محدود اور وسیع میدان میں داخل ہو رہے ہو جہاں تم پر بے شمار فرائض کا بار ہوگا۔ اگر تم نے ان فرائض کو صداقت اور قابلیت کے ساتھ ادا کیا تو دنیا اور عقبیٰ کی کامیابیاں تمھارے ہم قدم ہوں گی اور ہر وقت اور ہر لحظہ تم کو سکونِ خاطر اور

اطمینانِ قلب حاصل رہے گا۔ تم ایک ایسی تعلیم گاہ کے طالب علم ہو جو حکومت و رعیت اور ابنائے وطن کے اشتراکِ عمل کا نتیجہ ہے۔ تمھاری تعلیم گاہ کی سوسائٹیاں، اس کی عمارتیں، اس کی امدادیں، اس کے تمغے اور وظیفے غرض اس کی ہر ایک چیز جس پر تم نظر ڈالو گے اس میں اسی اشتراکِ عمل کو جلوہ گر پاؤ گے۔ اس لیے اس کے مطابق حکومت اور اہلِ وطن کے ساتھ تمھارے مخلصانہ اشتراکِ عمل تمھارا طغرائے امتیاز ہونا چاہیے۔ اسی غرض سے تمھارے دارالعلوم کا دروازہ بلا لحاظ قوم و مذہب ہر ایک طالب علم کے لیے کھلا ہوا ہے اور مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی ہے کہ اصحاب ہنود بھی اس سے فائدہ اٹھانے میں تامل نہیں کرتے۔

اس وقت ملک میں جو سیاسی فضا موجود ہے اس کے اقتضا سے نوجوان تعلیم یافتہ جماعت کے قلوب متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے اور یقیناً ہر ایک غور و فکر کرنے والے دل و دماغ کو اپنے ماحول کے متعلق سوچنے اور سمجھنے کا حق حاصل ہے اس لیے مجھے اپنا یہ اہم فرض محسوس ہوتا ہے کہ اس موقع پر میں تم کو چند مختصر الفاظ میں یہ جتا دوں کہ تم جس پاک اور مقدس مذہب کے پیرو ہو وہ ایک ایسا عملی مذہب ہے جس نے روحانی تربیت کے ساتھ ساتھ عملی زندگی کے لیے بھی گھر کے حجرہ سے لے کر لامعلوم وسعت کائنات تک ہر ایک مرحلہ کا طریق کار بتا دیا ہے اور جس میں سیاسی اور اقتصادی معاملات تمدنی، اور معاشرتی مسائل اور حکومت و رعیت کے باہمی تعلقات پر بہترین ہدایتیں موجود ہیں پس اگر تم اسی طریق کار کو پیش نظر رکھو گے اور انھیں ہدایتوں پر عامل رہو گے تو زندگی کا مبہم سے مبہم مسئلہ اور مشکل سے مشکل عقدہ بھی تمھارے لیے آسان ہو جائے گا اور دنیا کے پیچیدہ سے پیچیدہ راستے اور کٹھن سے کٹھن گھاٹی میں بھی تمھارا قدم نہ ڈگمگائے گا۔ تم ہر ایک معاملہ کے متعلق صحیح رائے قائم کر سکو گے اور ہر ایک مرحلے میں درست طرزِ عمل اختیار کر سکو گے۔ ہم کو اپنے منعم حقیقی سے ہمیشہ یہی دعا مانگنے کی تعلیم دی گئی ہے کہ اِهْدِ نَاالصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْم ہ

فرزندانِ ملت! اگرچہ ظاہر میں تم کتابی اور کاغذی امتحانات کی تیاری میں مصروف ہو لیکن حقیقت میں تم ایک ایسے میدان مقابلہ میں داخل ہونے کے لیے تیار ہو رہے ہو جہاں روحانی، اخلاقی، دماغی اور جسمانی قوتوں کے بغیر کوئی کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ تمھاری تعلیم کا سب سے بڑا مقصد انھیں تمام قوتوں کا نشوونما تھا اگر یہ شروع ہو گیا ہے تو اِنَّ الْاَرْضَ يَـرِثُهَـا عِبَـادِيَ

الصّٰلِحُوْنَ کا سچا وعدہ تمھارے ساتھ ہے اور دنیا اور آخرت کی کامیابی کی کنجی تمھارے ہاتھ میں ہے خدا مبارک کرے لیکن اگر تم نے ان مواقع سے استفادہ کرنے میں تساہل کیا ہے اور تم میں خامیاں باقی رہ گئی ہیں تو اس کی تلافی زمانہ کے تلخ تجربات اور ناخوشگوار تادیب کے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا لیکن کسی نے سچ کہا ہے کہ "زمانہ بڑا سخت گیر استاد ہے۔"

بہر حال اس وعدۂ ربانی میں ذرا بھی شائبہ شک نہیں ہو سکتا کہ اَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی وَ اَنَّ سَعْیَهٗ سَوْفَ یُرٰی ثُمَّ یُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰی ہ

حضرات! اب میں اپنی تقریر کو ختم کرتی ہوں اور امید کرتی ہوں کہ آپ صاحبان میرے ساتھ اس دعا میں شریک ہوں کہ رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْکَ رَحْمَةً وَّ هَیِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا ہ

**ہر ہائنس بیگم سلطان جہاں کی وہ یادگار تقریر جو انھوں نے لیڈیز کلب میں 29 جنوری 1912 کو ارشاد فرمائی۔**

ممبران کلب!

میں تمھارے ایسے پُر جوش طریقے سے خیر مقدم کرنے اور تم سب کی اس سچی محبت کی جو ہر موقع پر نہایت شاندار طرہ سے نمایاں ہوتی ہے بہت قدر کرتی ہوں۔

اس میں شک نہیں کہ سفر یوروپ سے واپس آنے کے بہت دیر بعد آج ہم سب اس کلب میں جمع ہوئے ہیں۔ لیکن اس دیر کا سبب بھی بہت ہی مبارک تھا یعنی دربار دلی کی تیاریاں اور مصروفیتیں اس اجتماع کی مانع رہیں اور یہ مصروفیتیں ایسی سعید و مبارک تھیں کہ جن کے باعث ہم میں سے کسی کو اس دیر کا افسوس نہ ہوگا۔

خواتین کلب! تمھارے خیالات جو میری ذات کی نسبت ہیں ضرور قابل عزت ہیں اور میں ان کی وقعت کرتی ہوں مگر ان خیالات سے زیادہ تر میں اس عمل اور فعل کی قدر اور عزت کرتی ہوں جو میری ہدایتوں اور نصیحتوں اور ارادوں کے متعلق تم سے ظاہر ہوتے ہیں۔

یاد رکھو میرے لیے دنیا میں سب سے زیادہ خوش کرنے والی چیز یہ ہے کہ میں اپنی تمام کوششوں کو سرسبز دیکھوں اور خاص کر اس کوشش کو جس کا تعلق اپنی جنس کی بہتری اور فائدے سے ہے۔

تم نے میرے جشن تاج پوشی لندن میں شریک ہونے، دربار لیوی میں باریاب ہونے، اعلیٰ

حضرت ملک معظم قیصر ہند وعلیا حضرت ملکہ معظمہ قیصر ہند کی نوازشہائے خسروانہ سے ممتاز وشرف یاب ہونے کو کوئن آف انڈیا کے خطاب ملنے پر جو اظہار مسرت کیا ہے درحقیقت یہ تمام باتیں میری تمام رعایا خاندان اور احباب کے لیے باعثِ افتخار ومسرت ہیں اور میں پہلے خدا کا اور اس کے بعد اپنے شہنشاہ اور شہنشاہ بیگم کا شکریہ دلی ارادت کے ساتھ ادا کرتی ہوں کہ جناب ممدوحین نے ایسے مراحم خسروانہ مبذول فرما کر مجھ کو افتخار واعزاز عطا فرمایا۔ اور مجھے امید ہے کہ میری امن پسند رعایا ایسے عزیز وکریم شہنشاہ وشہنشاہ بیگم کی افزونی اقبال وعمر کے لیے بارگاہ الٰہی میں ہمیشہ خلوص دل سے دعا کرے گی اور جس طرح کہ میرے دل میں وفاداری واطاعت اور عقیدت ومحبت کا جوش ہے ایسا ہی میری رعایا اور خاندان میں رہے گا۔

استنبول میں اعلیٰ حضرت سلطان المعظم اور علیا حضرت سلطانہ سے جو شرف ملاقات حاصل ہوا اور اس ملاقات کے نتیجہ میں جو بیش بہا اور گراں قدر تحف یعنی موئے مبارک رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی ریش اطہر کا مجھ کو نصیب ہوا، اس کے لیے میں سلطان المعظم کی بہ دل ممنون ہوں۔ لیکن یہ بھی ہمارے شہنشاہ اور ہماری فیاض گورنمنٹ کی عنایت، آزاد خیالی اور اعتماد کی روشن دلیل ہے کہ ہندستانی والیانِ ملک ممالکِ دنیا کی سیر وسیاحت کر کے معلومات وتجربات حاصل کرتے ہیں اور غیر ملکوں کے فرماں رواؤں سے ملتے ہیں۔ مجھے استنبول جانے اور سلطان المعظم سے ملنے کی نہایت خوشی کے ساتھ اجازت عطا فرمائی گئی اور ہر موقع پر سلطنت انگریزی کے سفیر نے میرے احترام کا خیال رکھا۔

معزز خواتین! میں دس ماہ پہلے اسی کلب کے جلسہ میں جو تم نے مجھے خدا حافظ کہنے کے لیے منعقد کیا تھا، تم سے کہا تھا کہ میرے اس سفر کی بڑی غرض یہ بھی ہے کہ اپنی آنکھوں سے یورپ کی ترقی یافتہ حالت دیکھوں اور وہاں سے جو خوبیاں اخذ کروں۔ ان سے اپنے ملک اور اپنی قوم کو فائدہ پہنچاؤں۔ میں نے اس غرض کے واسطے جو کچھ تجربات حاصل کیے ہیں ان کا اظہار انشاءاللہ تعالیٰ آئندہ عملاً کرنا چاہتی ہوں جو کہ اپنے اوقات معینہ پر ہوگا۔ مگر ان تجربات کے فائدہ کو مکمل ہونے کے لیے تعلیم کی اشد ضرورت ہے۔

میں نے اس سفر میں مختلف ملک جہاں مختلف طریقوں سے حکومت ہوتی ہے دیکھے اور وہاں

اگر چہ زیادہ نہیں تاہم اکثر اشخاص سے بھی ملاقات کا موقع ملا۔ ان کی عادتوں اور خصلتوں کو معلوم کیا۔ طرز معاشرت پر نظر کی، رفاہ عام کے کام، انسانی آسائش و آرام کے اسباب معائنہ کیے۔ ملکوں کو آباد، زراعت کو سرسبز، دولت کو نمایاں دیکھا۔ باشندوں میں اخلاق و متانت آزادی وطن کی محبت تہذیب و بلند حوصلگی مخلوق خدا کے ساتھ ہمدردی پائی۔ ان خصائل کے جانچ کرنے کا موقع مجھے انگلستان میں زیادہ حاصل ہوا اور یہ تجربہ وہیں کے لوگوں سے حاصل کیا۔

میں نے یہ عمدہ خصائل جوان اور سن تمیز پر پہنچے ہوئے لوگوں میں ہی نہیں دیکھے بلکہ معصوم بچوں میں بھی یہی نمایاں صفات ہیں۔ غرض میں نے اس سیاحت میں اپنا وقت فضولیات میں نہیں صرف کیا۔ بلکہ جس بڑے مقصد کے واسطے یہ سفر اختیار کیا تھا اسی کو پیش نظر رکھتی رہی۔ میرے تجربات و نتائج سیاحت بہت طولانی اور تفصیل طلب ہیں جن کو بشرط حیات موقع بہ موقع عملاً ظاہر کرنا چاہتی ہوں، خدا میرے ارادے میں کامیابی دے۔ اس وقت صرف اس قدر کہنا کافی سمجھتی ہوں کہ یہ تمام عمدہ خصلتیں اور نیکیاں روز افزوں دولت اور ترقی ماؤں کی تعلیم یافتہ ہونے اور اپنے بچوں کو ابتدا سے خود تربیت کرنے کے ثمر ہیں۔

آغوشِ مادر کی یہ تربیت گاہیں یا مدرسے مزدوروں کے گھروں سے لے کر امرا اور بادشاہوں کے محلوں تک موجود ہیں۔ مائیں تعلیم یافتہ ہیں جو اپنے بچے کی خود ہی استاد اور معلم ہیں۔ وہ خود حفظ صحت کے اصول پر اپنی زندگی بسر کرتی ہیں اور ان ہی اصول کے ساتھ بچوں کی پرورش کرتی ہیں جس سے بچوں کی نشو ونما پر اچھا اثر پڑتا ہے۔ ابتدا سے ان کو جھوٹ سے نفرت انسانوں کے ساتھ بھلائی کرنے کی ترغیب اپنے ملک اور قوم کی محبت چھوٹوں کے ساتھ شفقت بڑوں کا ادب عالی حوصلگی بلند ہمتی اور اپنے بادشاہ کی سچی عزت و اطاعت کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اور نو دس سال کی عمر تک اس تعلیم کے کتنے ہی درجے طے ہو جاتے ہیں۔

یہ تعلیم جو مہد سے شروع ہوتی ہے۔ ایسی پختہ اور مضبوط ہوتی ہے جس کا اثر لحد تک قائم رہتا ہے اور اسی تعلیم کا نتیجہ ہے کہ اس وقت یورپ تمام روئے زمین کا سرتاج بنا ہوا ہے اور یورپ میں انگلستان اور اس تاج میں نہایت قیمتی اور چمکتا ہوا ہیرا ہے جس کی آب و تاب نے سب کو ماند کر رکھا ہے۔ لیکن اس سے خواتین تم کو ہمت ہارنی نہ چاہیے دو سو برس پہلے اسی یورپ میں جس کو آج

ہندوستان میں تمثیلاً پیش کیا جاتا ہے عورتیں تعلیم سے بالکل محروم تھیں مگر مردوں نے تعلیم حاصل کی۔ عورتوں کی تعلیم کی ضرورت سمجھی اور ان کو مدد دی۔ عورتیں بھی ہمت و کوشش کے ساتھ مصروف ہوئیں۔ امیروں نے غریبوں کی مدد کی۔ ایک نے دوسرے کو توجہ دلائی اور آج وہ آسمان تعلیم کا تارا بن گئیں۔

پس اے ممبرانِ کلب تمھاری زندگی کا حقیقی مقصد یہ ہونا چاہیے کہ جہاں تک تمھاری طاقت و قدرت ہو اپنی جنس کو تعلیم کی طرف مائل کرو۔ غریبوں کو مدد دو اور تمام نیکی کے کاموں سے زیادہ نیکی کا کام اپنی جنس کی تعلیمی مدد سمجھو۔ اس لیے بجائے فضول تقریبات اور اخراجات کے زنانہ اسکول، زنانہ کلب اور ایسے رسالوں اور اخباروں کو جو تمھارے فائدہ و دلچسپی کے واسطے جاری ہیں۔ امداد دو کیونکہ ہر قسم کی کامیابیاں اور ترقیوں کا سنگِ بنیاد تعلیم نسواں ہی ہے۔ یاد رکھو کہ اگر ایک نسل بھی تعلیم یافتہ ہو جائے گی تو انشاء اللہ تمھارے ملک تمھاری قوم اور تمھاری جنس کا جہازِ افلاس و ادبار کے طوفان سے نکل جائے گا۔ لیکن میں اس تعلیم کے ساتھ اس آزادی کو پسند نہیں کرتی جو اعتدال سے متجاوز ہو چکی ہے اور ہمارے یہاں کی پردہ نشین ناخواندہ بلکہ خواندہ عورتوں کو کبھی اس کا خیال بھی نہیں گزر سکتا۔ ممکن ہے کہ یہ آزادی جو سرزمینِ یورپ میں ہے وہاں کے مناسب ہو۔ یا یہ آزادی مذہب عیسوی کی تلقین و ہدایت کے مطابق ہو۔ مگر ہندوستان اور بالخصوص مسلمانوں کے لیے کسی طرح اور کسی زمانہ میں میرے خیال میں نہ موزوں ہوگی اور نہ خداتعالیٰ کے احکام کبھی غیر مقدم ہو سکتے ہیں۔ پس ہم کو اس حدیث پر عمل کرنا چاہیے خُذْ مَا صَفَا وَ دَعْ مَا کَدِرَ اچھی چیزوں کو لو اور بری چیزوں کو چھوڑو۔ مسلمان عورتوں کو کبھی اس آزادی سے زیادہ کی خواہش نہیں کرنی چاہیے جو مذہب اسلام نے ان کو عطا کی ہے۔ اور وہ آزادی ایسی ہے جو عورت کو اپنے حقوق سے مستفید ہونے اور تمام خرابیوں سے محفوظ رہنے کا ذریعہ ہے۔

میں یہاں پر یہ افسوس ظاہر کرتی ہوں کہ ترکی کی خواتین جہاں تعلیم کی طرف راغب ہو رہی ہیں وہاں ان میں یورپ کی سی آزادی کا بھی میلان طبع ہے۔ جس نے ان کو یقیناً فی زمانہ ایک خطرناک راستہ پر ڈال دینے کا اندیشہ پیدا کر دیا ہے۔ خدائے تعالیٰ ان کو صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا کرے جو ان کی عزت کے واسطے مفید ثابت ہو۔

ہماری قومی تاریخ ہم کو جتا رہی ہے کہ مسلمان عورتوں نے اسلام اور شعائرِ اسلام کی پابند رہ کر دنیا میں کیسے کیسے کارہائے نمایاں کیے ہیں، کس طرح علوم وفنون میں دست گاہ حاصل کی اور ان کی تربیت وتعلیم نے کیسے کیسے اولوالعزم عالم اور مشہور اشخاص پیدا کیے۔ دور کیوں جاؤ خود بھوپال میں اسی نتیجہ تعلیم پر نظر ڈالو اور گزشتہ دونوں فرماں روا بیگمات کے حالات دیکھو جو تعلیم کے اعلیٰ نتائج ہیں۔

غرض تعلیم حاصل کرو اور پابند طریق اسلام رہو تاکہ تمھاری قومی ترقی ہو اور تم کو ہر قسم کی کامیابی حاصل ہو۔

یہ اللہ کا بڑا کرم ہے کہ سلطنت تعلیم کی حامی ہے اور مالک سلطنت کی سب سے بڑی آرزو اپنی رعایا میں تعلیم کی اشاعت اور ترقی ہے۔ پس اگر اس وقت ہم نے تساہل کیا تو اپنے ہاتھوں سے نقصان عظیم اٹھائیں گے۔

---

1: Deptt. of Education

2: Deptt. of Zoology

3: Deptt. of Botany

4: بیگم سلطان جہاں صاحبہ اپریل 1911 میں یورپ کے سفر پر تشریف لے گئی تھیں۔ سفر سے واپسی پر لیڈیز کلب، بھوپال میں ان کا استقبال کیا گیا اس موقع پر بیگم صاحبہ نے یہ تقریر فرمائی تھی۔

## درباری لباس (سرکلر)

مورخہ 8 ستمبر 1909 (22 شعبان 1327ھ) مثل نمبر 32-1909 عیسوی

علیا حضرت دام سلطنتہا کا ارشاد ہے کہ جو لوگ درباروں میں شریک ہوتے ہیں، وہ مختلف اللون لباس میں شریک ہوتے ہیں جو نہایت بدنما اور آداب دربار کے خلاف ہے۔ لہٰذا بہ نظر تہذیب دربار حضور ممدوحہ نے حسب تفصیل ذیل درباری لباس قرار دیا ہے۔

(1) شیروانی سیاہ رنگ (2) کورٹ شو سیاہ ولایتی

(3) موزہ سیاہ باریک (4) پائجامہ سفید

(5) سیلہ سفید (6) کمر بند لیس

نوٹ: صرف جاگیردار صاحبان کو پرتلہ لیس میں کرچ یا تلوار لگانے کی اجازت ہے اور دوسرے گارڈن پارٹی وغیرہ کے جلسوں میں شرکا کو بجائے سیاہ شیروانی کے سفید شیروانی اور بجائے کورٹ شو کے دیگر قسم کے ولایتی بوٹ کا بھی استعمال کرنا جائز ہے۔

ان تمام اصحاب کو جو درباروں میں شریک ہوتے ہیں۔ لازم ہے کہ حسب ہدایت متذکرہ بالا اپنا اپنا لباس تیار کرا کر رکھیں اور وقت شرکت دربار اُس کو استعمال کیا کریں۔

چونکہ اوائل ماہ نومبر ہز اکسیلنسی وائسرائے کشور ہند بھی تشریف لانے والے ہیں، اس لیے ان اصحاب کو جو سرکاری درباروں میں شریک ہونے والے ہیں عموماً اور جو وائسرائے دربار میں شرکت کا اعزاز حاصل کرنے والے ہیں ان کو خصوصاً اپنا اپنا لباس مرتب و تیار رکھنا چاہیے۔ تا کہ بروقت تیاری کے وقت و پریشانی ان کو لاحق نہ ہو۔

فقط

(ہدایات سلطانی حصہ اول (2۔فائنل 3۔متفرق، ص20)

اشتہار متعلق شعبہ مال و بندوبست

مورخہ 13 محرم 1320ھ مطابق 22 اپریل 1902

نقل اشتہار مجاریہ روبکاری جناب نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ والیہ ریاست بھوپال دام اقبالہا

عنایت الٰہی سے ہم کو رعایا کی پرداخت بطیب خاطر منظور ہے اور جناب باری سے تمنا ہے کہ ان کی خوشحالی مثل زمانہ نواب سکندر بیگم صاحبہ خلد نشیں، و شروع عہد ہماری والدہ نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ خلد مکاں کی اپنی آنکھوں سے دیکھوں۔ میں نے بجائے معیادی سالہ کے بندوبست سترہ سالہ اس واسطے قرار دیا ہے کہ اس میعاد تک ریت بندی بندوبست بست سالہ کہ پاسی بوجوہات چند در چند یعنی قحط سالی و آفات ارضی و سماوی وغیرہ وغیرہ جو بالفعل قابل لحاظ ہے نرم کر کے اور رعایت بحال ملحوظ رکھ کر ان کو فائدہ پہنچایا جاوے تا کہ کاشتکاران کو استعداد آبادی اس زمین کی جو اندر نہ (9) سالہ گزشتہ زمانہ نقصانی کے گر گئی ہے حاصل ہو، پس حسب ذیل یہ اشتہار جاری کیا جاتا ہے۔

(1) جو دیہات بندوبست طلب ہیں ان میں بعد مینڈ میلان کے رعایت مناسب کی جائے گی کہ جو نفع بخش مزارعان ریاست کی ہوگی نیز دیہات مذکورہ کی مینڈ میلان و جانچ اقسام کی نہایت صحت سے ہو کر اصلاح مناسب کی جائے گی۔

(2) کامل کاشتکاران دیہات میدانی و کوہی کو چوبینہ آلات کشاورزی خانہ بندی سالوار فیصدی مال پر پنج روپیہ محصول تہل بھرتی معاف کیا جائے گا۔

(3) پیشتر محصول تہل بھرتی چوب تعمیری کا منشی امتیاز علی صاحب وزیر مرحوم نے حسب ذیل مقرر کیا تھا میال، گولیہ، گیڑہ، بانس، ازاں جملہ ارابہ ایک روپیہ عام طور پر محصول چوبینہ قائم رکھ کر باقی ماندہ بہ نظر پرورش و پرداخت رعایا معاف کیا جائے گا۔

(4) خار بالگزصرفہ کاشتکاری رعایا کو عام طور پر ہیزم سوختنی بھی بلا محصول تہل بھرتی جنگل و نیز سائر معاف کیا جائے گا۔

(5) بندوبست کپاسی میں حق تھا چاہی کے درختان انبر وغیرہ و درختان مہوہ وانبہ موقوعہ کشت و مینڈ کشت پر جمع باندھی گئی ہے وہ معاف کی گئی۔

(6) کاشتکاران وغیر کاشتکاران ساکنان اسی دیہہ پر جن کی جائے سکونت کا جنگل ہے اور وہ ہمیشہ مویشی اپنی اسی موضع کے جنگل میں چراتے ہیں اور رقم چرائی وزیر صاحب سابق کے عہد سے بنادھ لی گئی ہے وہ یک قلم معاف کی گئی۔

(7) جو بقایا ذمہ مستاجران و کاشتکاران واجب الاصول ہے بعد ملاحظہ امثلہ و نقشہ جات بقایا ان میں رعایت مناسب کی جائے گی اور باقی ماندہ کی سبیل مستاجران و آسامیان سقیم الحال سے براہ قسط بندی آسانی کے طور پر کر دی جائے گی۔

(8) جو زمین زیادہ عرصہ کی افتادہ ہے اس پر پانچ سال تک معافی دی جائے گی اور افتادہ مابین سہ سالہ سے جو زمین پڑتی و چاہی و بارانی آسانی سے آباد ہو سکے اس کو سال اول و دوم و سوم و چہارم و پنجم حسب مقدرت آسامیان و مستاجران شامل عمل کیا جائے گا اور چاہی اس میعاد پنج سالہ کے اندر آباد نہ ہو سکے وہ شامل بارانی کی جائے گی اور نصف ممکن الزراعت بندوبست بست سالہ معاف کی گئی ہے۔ اس کو آباد کرنے کا مستاجر و

کاشتکار کا اختیار ہے۔ اس پر بوجہ تکمیل جمع کپاسی ترمیم شدہ کے جداگانہ عمل نہ باندھا جائے گا۔

(9) جن دیہات کے پٹے اب تک نہیں دیے گئے اور جن دیہات کی جمع بھی اب تک ریاست کی منظوری سے نہیں طے ہوئی اور ان کے سوا دیہات باقی ماندہ بندوبست کے واسطے جو قواعد مقرر کیے گئے ہیں وہ درج اشتہار ہذا ہیں۔ جن دیہات کے پٹہ جات بندوبست فی سالہ دے دیے گئے وہ ان شرائط اشتہار سے مستثنیٰ ہیں۔

(10) فیصدی بیگہ مزروعہ و ممکن پر، دہ (10) بیگہ چرودکھر حسب قاعدہ بندوبست گزشتہ معاف رکھی گئی۔

(11) مطالبہ سرکاری یا ساہوکاری میں کاشتکاران و متاجران کے آلات کشاورزی و مکان سکونتی تا قیام کاشتکاری فروخت و نیلام نہ ہوں گے۔

(12) بجز مہوہ لاکھ درختان صحرائی جملہ پیداوار میدانی و صحرائی مثل اچار، تیندو و بیل، بیر، مکوئی، کرونده، ساخوروه، جُھر جُھر د، کندزمین ہر قسم، کسیرو، ہڑ، بہیڑہ، آنولہ، دہوکری وغیرہ وغیرہ اشیاء قدرتی سے کسی رعایا کی مزاحمت کا کسی متاجر یا ملازم کو حق نہ ہوگا البتہ چونہ سازان و کتھا سازان معافی چوب کے قواعد سے مستثنیٰ رہیں گے۔

(13) ویران گاؤں کے بسانے اور آباد کرنے والے کو ایک ہزار بیگہ پر پچاس بیگہ زمین ممکن بلاعمل تا میعاد بندوبست دی جائے گی اور جس صورت میں متاجر مذکور میعاد بندوبست میں گاؤں کو سرسبز و شاداب دکھلائے گا تو اس کو دس بیگہ زمین ممکن اور بصورت نہ باقی رہنے ممکن کے مزروعہ معافی دوامادی جائے گی۔

(14) جو متاجران زمین دیہہ ویران کو آباد کریں انھیں زمین کی لکڑی کاٹنے اور اپنے صرف میں لانے کا اختیار ہوگا۔

(15) جو شخص متاجران و کاشتکاران دیہہ سے اراضیات ممکن و مزروعہ میں باستثناء کنارہ جات ندی و نالہ داوڑی اپنے صرف سے بنا کر باغ لگائے گا تو دو بیگہ تک زمین کا اس سے عمل بارانی اور دو بیگہ سے زائد کا عمل چاہی لیا جائے گا۔

(16) باڑہ ہائے ملحقہ مکانات کاشتکاران جو پہلے معاف تھے اور مستاجران نے ان پر عمل باندھ لیا ہے وہ بالکل مثل سابق معاف رہیں گے، نہ سرکار میں ان کو لیا جائے گا نہ مستاجروں کو ملے گا۔

(17) جس طرح باعتبار ضمانت معتبر سادار وخود معتبری مستاجری اس ریاست میں مستحق ہے اب بھی ملے گی اور رعایا سے ملک غیر بھی اگر جائداد منقولہ وغیر منقولہ موجودہ ریاست ہٰذا سے اطمینان کامل کر سکے تو ان کو بھی مستاجری ملے گی بشرطیکہ وہ لوگ زراعت پیشہ ہوں و نیز واسطے حفاظت جان و مال رعایا کے انتظام پولیس ریاست بقائمی چوکیات وغیرہ بخوبی کیا جائے گا۔

(ہدایات سلطانی حصہ اول مال بندوبست، ص 8 تا 11)

## چند قوانین ریاست بھوپال

### قانون اوقاف نمبر 4

نواب سلطان جہاں بیگم نے 4 دسمبر 1919 کو منظور کیا۔

حدود ریاست بھوپال میں جو اوقاف موجود ہیں ان کی نگرانی اور انتظام کے لیے یہ قانون بنایا گیا۔ اس کی چند دفعات درج ذیل ہیں:

دفعہ 1: جائز ہے کہ یہ قانون، قانون اوقاف ریاست بھوپال نمبر 4، 1919 کے نام سے موسوم کیا جائے۔

دفعہ 2: قانون ہٰذا کل ریاست بھوپال سے متعلق اور 17 ربیع الاول 1338ھ مطابق 11 دسمبر 1919 سے نافذ پذیر ہوگا۔

### قانون نمبر 1336 محمدی یعنی قانون لگان ملک بھوپال

اس میں کاشت کاروں کی قسمیں، کاشتکاروں کے حقوق اور ذمہ داریاں، بے دخلی، ترقی جنت اراضی قرقی کا اختیار وغیرہ باب قائم کیے اور ان کے متعلق قوانین بتائے ہیں۔ آخر میں دو ضمیمہ دیے گئے ہیں۔ پٹہ کے لیے فارم کا نمونہ بھی درج ہے۔

**قانون نمبر 2**

1910 یعنی قانونی کارروائی سرسری دخل دہانی اراضی کاشت۔

اس میں 18 دفعہ بتائی گئی ہیں۔ 4 ضمیمہ میں۔ یہ رسالہ 10 صفحات پر مشتمل ہے۔ مطبع سلطانی بھوپال باہتمام منشی محمد حمید اللہ طبع ہوا۔

**قانون نمبر 15۔1336 محمدی**

بغرض قواعد اجرائے وارنٹ گرفتاری و حوالات باقی داران مال گزاری اراضی۔ قواعد اجرائے دستک وطلبی نامہ۔

**قانون نمبر 11۔1337 محمدی**

یعنی قانون تقاوی ترقی زراعت و حیثیت اراضی ریاست بھوپال۔ یہ قوانین 26 دسمبر 1908ء، 5 جدی 1337م کو نواب سلطان جہاں بیگم کی موجودگی میں 9 عہدیداران کے مشورہ سے پاس ہوا جن کے نام درج کیے گئے ہیں۔ یہ تین صفحات پر مشتمل ہے۔

**قانون نمبر 1۔1914 میں قانون سوسائٹی ہائے (انجمن ہائے) امداد باہمی ریاست بھوپال۔**

اس میں 9 دفعات ہیں۔ دفعہ 4۔ کن سوسائٹیوں کی رجسٹری ہو سکتی ہے۔ میں نے لکھا ہے:

> ''ہر ایسی سوسائٹی جس کی یہ غرض ہو کہ اس کے ممبروں میں کفایت شعاری کا شوق امداد باہمی کے اصول کے مطابق پیدا ہو یا ہر ایسی سوسائٹی جو اس غرض سے قائم ہو کہ کسی سوسائٹی اول الذکر کا کاروبار چلانے میں مدد لے اس کی رجسٹری اس قانون کے مطابق محدود یا غیر محدود ذمہ داری کے ساتھ ہو سکتی ہے۔''

یہ رسالہ 48 صفحات پر مشتمل ہے۔ مطبع سلطانی میں 1914 میں منشی محمد عبید اللہ کے اہتمام میں طبع ہوا۔

**قواعد سربراہ**

نواب سلطان جہاں بیگم نے تمہید میں لکھا ہے کہ ''بغرض بہم رسانی رسد و بار برداری و مزدوران کے یہ قواعد 9 نومبر 1918ء، 4 صفر 1337ھ سے نفاذ پذیر ہوں گے''۔ آخر میں فارم اور اسکیل کے

خا کے شامل ہیں۔ یہ 32 صفحات پر مشتمل ہے۔ 1918 میں باہتمام منشی محمد عاشق مطبع سلطانی بھوپال میں طبع ہوا۔

**ہدایات در بار ترتیب و ترسیل نقشہ جات ایجنسی وغیرہ**

اس میں 12 دفعات ہیں۔ آخر میں مختلف دفعات سے متعلق 19 فارم کے نمونے شامل ہیں۔ یہ 40 صفحات پر مشتمل ہے۔ 1914 میں باہتمام منشی مولوی محمد حمید اللہ۔ مطبع سلطانی ریاست بھوپال میں طبع ہوا۔

**قواعد رجسٹرار قانون گویان**

یہ 16 فصلوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ان فصلوں کی مختلف دفعات ہیں۔ ان کی تعداد 89 ہے۔ آخر میں 35 فارم کے نمونے شامل ہیں۔ یہ رسالہ 129 صفحات پر مشتمل ہے۔ 1914 باہتمام مولوی محمد حمید اللہ مطبع سلطانی ریاست بھوپال میں طبع ہوا۔

**اعلان متعلق صیغہ جنگل**

اعلان مندرجہ جریدہ بھوپال مطبوعہ 27 صفر 1325ھ مطابق 11 اپریل 1907

ہر ہائینس نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ رئیسہ دلاور اعظم اعلیٰ طبقہ سلطنت ہند رئیسہ بھوپال نے مستاجران و کاشتکاران کو ایسی زمین مقبوضہ زیر کاشت لانے کے لیے کہ جس میں جنگل ہو اس کی صفائی درختان کی نسبت مفصلہ ذیل قواعد منظور فرمائے۔ یہ قواعد کل ریاست بھوپال کے لیے سمجھے جائیں گے اور فوراً نافذ العمل ہوں گے۔

1۔ مستاجر و کاشتکار کو جو اپنی زمین قابل کاشت کا صاف کرنا چاہے، لازم ہے کہ بہ ادائے محصول درختوں کے کاٹ ڈالنے کی اجازت حاصل کرنے کے لیے درخواست سادہ کاغذ پر پیش کرے جس محصول کی شرح قاعدے (8) مفصلہ ذیل میں مندرج ہے درخواست میں یہ درج کیا جائے گا کہ کھیت کون سے گاؤں میں واقع ہے۔ اور مقبوضہ زمین کا نمبر خسرہ کیا ہے۔ ایسی درخواست بہ تصدیق و بذریعہ تحصیلدار یا ناظم صاحب مہتمم جنگل کے پاس بھیجی جائے گی۔

2۔ سائل کو یہ شرط قبول کرنا ہوگا کہ تاریخ اجازت صفائی جنگل سے ایک سال کے اندر زمین کو آباد کرے۔

3۔ ایسی درخواست پیش ہونے پر مہتمم صاحب جنگل درختہائے متعلقہ کی پیائش بلحاظ ان کی گولائی کے درجہ کے کئی درجہ کے کئی خانے کا حکم صادر کریں گے۔

4۔ ہر ضلع میں ممکن زمین پر درختوں کی تعداد کے شمار کرنے کے لیے ایک آفیسر بنام نہاد فارسٹر کی منظوری حال میں سرکار عالیہ سے ہو چکی ہے، متعین کیا جائے گا۔ اگر شمار کا کام زیادہ ہو جائے گا تو ایک یا زیادہ حسب ضرورت فارسٹر مقرر کیے جائیں گے۔

5۔ صاحب مہتمم جنگلات کے سررشتہ سے جب کوئی درخواست فارسٹر کے پاس آئے گی تو وہ فوراً موضع پر حاضر ہوگا اور از روئے صحیح پیائش کے یعنی بلحاظ گولائی کے مفصلہ ذیل درختوں کی فہرست مرتب کرے گا۔

ساگوان، ساج، شیشم، بیجا، تینسدو، ببول، کوہا۔

6۔ عام طور پر انبہ و مہوہ کے درخت کاٹنے کی اجازت نہ دی جائے گی۔

7۔ درختوں کی شمار کے وقت فارسٹر درختوں کے اقسام بلحاظ عمارتی مصرف کے تیار ے گا اور وہ فہرست سررشتہ جنگل کو بھیج دے گا۔

8۔ مہتمم جنگل درختوں کی قیمت بلحاظ برخنامہ منظور فرمودہ سرکار عالیہ مقرر کریں گے۔ عمدہ درختوں پر پوری قیمت لگائیں گے اور ناقص درختوں پر بلحاظ موقع قیمت میں کمی وبیشی کریں گے۔

9۔ مہتمم جنگل اس فہرست کو تحصیلدار علاقہ کے پاس بھیج دیں گے اور تحصیلدار اصل قیمت مجوزہ مہتمم جنگل وصول کریں گے اور مد صیغہ جنگل میں جمع کریں گے اور سائل کو درخت کاٹنے کا تحریری حکم دیں گے۔

10۔ سوائے ان (9) قسم کے درختوں کے جن کا ذکر دفعہ (5) و (6) میں کیا گیا ہے باقی تمام درخت کاشتکار کو بلا معاوضہ دیے جائیں گے لیکن اس کو لکڑی کے بیچنے کا اختیار نہ ہوگا۔

11۔ لیکن جس لکڑی کی بابت کاشتکار نے قیمت دی ہوا سے اندرون ریاست بھوپال بیچنے کا حق حاصل رہے گا۔ مگر حدود عملداری بھوپال سے اگر وہ باہر لے جائے تو اسے

محصول سائز یا دیگر محصول جو محصول سائز سے زیادہ نہ ہوگا۔ جس کو وقتاً فوقتاً دربار مشتہر کرے گا، ادا کرنا ہوگا۔

12۔ تجاویز مذکورہ بالا کے عملدرآمد کے لیے مہتمم جنگل وقتاً فوقتاً ایسے مفصل احکامات جاری کرتے رہیں گے جو ان قواعد کے موافق ہوں گے۔

13۔ اگر مذکورہ بالا سات اقسام کے درخت کسی کھیت میں ہوں اور جن کی قیمت پانچ روپیہ سے زیادہ نہ ہو تو مہتمم جنگل اپنے اختیار سے ان درختوں کے مفت کاٹے جانے کی اجازت دینے کے مجاز ہوں گے۔

14۔ لیکن ایسے درخت جو کسی بہتے نالے یا ایسے نالے کے کنارے کے دونوں اطراف میں دس دس فٹ کے اندر واقع ہوں جس میں پانی ہمیشہ بھرا رہتا ہو، کاٹنے کا کاشتکار کو اختیار نہ ہوگا۔

(ہدایات سلطانی حصہ اول باب 4 ص 23،24)

## تفویضِ حکومت اور تخت نشینی کا دربار

انگلستان سے واپس آنے کے بعد نواب سلطان جہاں بیگم نے 9 جون 1926 کو ایوانِ صدر منزل میں ایک بے مثال دربار منعقد کیا اور سلطنت اپنے فرزند حمید اللہ خاں کے سپرد کر دی۔ یہ دربار جس طرح کہ اپنے مقصدِ انعقاد کے لحاظ سے تاریخ عالم کا ایک بے نظیر واقعہ ہے اسی طرح اس کے انعقاد و ادائے مراسم کا طریقہ بھی بے مثال تھا، اور جس کی تمام تر ترتیب خود سرکار عالیہ نے فرمائی تھی۔ محمد امین زبیری[1] جو اس کے چشم دید گواہ ہیں وہ اس دربار کے تاثرات اور عظمت و جلال کو یوں بیان کرتے ہیں:

''دربار کی شان''

> 9 جون 1926 کو باضابطہ صدر نشینی کی رسم ادا کی گئی اور یہی تاریخ بہ حساب شہور قمری یعنی 27 ذیقعدہ 1344ھ علیا حضرت سرکار عالیہ دام ظلہا و اجلالہا کی سالگرہ ولادت کی تھی۔ تمام شہر جھنڈیوں اور بیرقوں سے آراستہ و پیراستہ تھا۔ ایوانِ صدر منزل جس میں بالعموم شاہی تقریبات ہوتی ہیں غیر معمولی طور پر سجایا گیا تھا۔ صدر دروازہ کے سامنے ماہی

مراتب اور گارڈ آف آنرمع بینڈ کے متعین تھا۔اندر کے حصہ میں مہتابی پر ریاست کا فتح نشان جو بانی ریاست کی بیگم کے نام سے موسوم ہے اور نشان قیصری جو 1877 کے دربار قیصری میں کوئن وکٹوریہ قیصرہ ہند کی طرف سے نواب شاہجہاں بیگم خلد مکاں کو عنایت ہوا تھا، استادہ تھا۔صدر منزل کے رفیع الشان اور زرنگار دالانوں میں درباریوں کی نشست تھی اور وسط میں تخت کے اوپر تین گنگا جمنی کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔تخت کے نیچے جانب راست ایک اور گنگا جمنی کرسی رکھی گئی تھی گیلریوں میں خواتین کی نشست کا انتظام تھا جن میں پردہ نشینوں کے لیے چکیں پڑی ہوئی تھیں۔

تمام ملکی وفوجی عہدہ دار، اخوان ریاست و جاگیردار اور علما کرام درباری کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔آٹھ بج کر دس منٹ پر ہر ہائینس علیا حضرت سرکار عالیہ پرنس عابدہ سلطان (نواب گوہر تاج بیگم، جو ہر ہائینس کی بڑی صاحبزادی ہیں) شاہانہ تزک واحتشام کے ساتھ رونق افروز ہوئیں۔قلعۂ فتح گڑھ سے سلامی سر ہوئی۔حاضرین دربار نے استادہ ہو کر تعظیم ادا کی۔جب ہر ہائینس اور علیا حضرت سرکار عالیہ نے تخت کی چپ و راست کرسیوں پر جلوس فرمایا اور نواب گوہر تاج بیگم نے نیچے والی کرسی پر جلوس فرمایا تو عالی قدر قاضی علی حیدر عباسی پولیٹکل سکریٹری نے افتتاح دربار کی اجازت مانگی۔اس کے بعد جو پُرعظمت منظر پیش ہوا وہ حقیقتاً تاریخ بھوپال ہی کا نہیں بلکہ تاریخ اسلام کا ایک عجیب وغریب مرقع اور علیا حضرت کے جذبات واحساسات مذہبی اور اپنے نور نظر کی حکومت کو کامیاب بنانے کی تمناؤں کا ایک جلوہ گاہ تھا۔

### تلاوتِ قرآن سے جلسہ کا افتتاح

مسلمانوں میں جب کوئی جلسہ شروع ہوتا ہے تو حصولِ خیر وبرکت کے لیے اس کا افتتاح قرآن مجید کے کسی رکوع سے کیا جاتا ہے اور حقیقتاً یہ وہ

مبارک طریقہ ہے جو ہر اسلامی جلسہ کا طغرائے امتیاز ہونا چاہیے لیکن ابھی تک یہ طریقہ عام قسم کے جلسوں میں استعمال کیا جاتا تھا مگر علیا حضرت نے اس پُرعظمت تقریب کو بھی اس اصلی عظمت وشان کے ساتھ شروع کیا جس سے زیادہ ایک مسلمان کے لیے کوئی عظمت وشان نہیں ہو سکتی تا کہ ایسے درباروں کے لیے ایک مثال قائم ہو اور جب کوئی جدید فرماں روا تختِ حکومت پر متمکن ہو تو سب سے پہلے اس کو اپنی عبدیت اور اپنے معبود اور مالک الملک کا تصور بھی پیدا ہو۔۔۔۔اس موقع ومحل کے لحاظ سے علیا حضرت نے آیتوں کا انتخاب فرمایا تھا۔ چنانچہ سورۂ یوسف کے گیارھویں رکوع اور سورۃ والضحیٰ کی تلاوت سے دربار کا آغاز ہوا۔

حضرت یوسفؑ کا قصہ توریت میں بھی موجود ہے اور قرآن مجید میں نہایت حکیمانہ طور پر ہر درجہ اور رتبہ کے انسان کے لیے ایک عبرت وبصیرت کی صورت میں بیان کیا گیا ہے اس میں وہ حصہ انتخاب کیا گیا جس میں حضرت یوسفؑ نے تمام مراحلِ زندگی کے بعد تختِ مصر پر جلوہ گر ہوتے ہوئے خداوند کریم کا شکریہ ادا کیا ہے۔

سورۂ الضحیٰ میں ہمارے نبی کریم، خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم مخاطب ہیں۔ خداوند تعالیٰ نے اپنے انعام واحسان کی یاد دلا کر یتیموں اور سائلوں کے ساتھ عمدہ برتاؤ کی نصیحت اور اپنی نعمت کے تشکر کی ہدایت کی ہے اور کیا حسنِ اتفاق ہے کہ ہمارے اعلیٰ حضرت بھی دولتِ یتیمی سے مالا مال رہے اور مالک الملک نے اعلیٰ حضرت پر بھی ویسے ہی انعامات فرمائے۔

غرض ایک خوش لہجہ قاری نے تختِ شاہی کے سامنے تلاوت کی۔ تلاوت شروع ہوتے ہی ہر ہائینس علیا حضرت اور تمام حضارِ دربار کلام پاک کی تعظیم وتکریم کے اظہار میں نہایت ادب کے ساتھ استادہ ہو گئے۔

جب تلاوت ختم ہوئی تو علیا حضرت نے حسبِ ذیل شاندار تقریر فرمائی:

## علیا حضرت کی تقریر

آج جس غرض سے یہ دربار منعقد کیا گیا ہے اس کا اظہار انگلستان سے بذریعہ تار کر چکی ہوں اور اس کے مطابق کیبنٹ سے جریدہ میں اعلام شائع ہو چکے ہیں۔ مجھے یہ معلوم ہو کر دلی مسرت و اطمینان ہے کہ ان اعلانات سے جس دور جدید کا آغاز ہوا ہے اس کا تمام طبقات رعایا اور اراکین دولت نے نہایت گرم جوشی کے ساتھ خیر مقدم کیا اور اپنے نئے فرماں روا کے ساتھ ان جذبات عقیدت کو جو رعایائے بھوپال کا تمغائے امتیاز ہے پر جوش طریقے سے نمایاں کر کے اپنی وفاداری اور عقیدت کیشی کا بہترین ثبوت دیا۔ آج پچیس سال سے کچھ زیادہ عرصہ گزرا کہ جب مالک حقیقی نے ملک محروسہ بھوپال کی زمام حکومت میرے سپرد کی آپ سب کو اس کا علم ہے کہ میں نے اپنی حیثیت مثل ایک امین کے سمجھ کر اور اس کی ودیعت کبریٰ کے اہم فرائض کا احساس کر کے فوراً ضروری اصلاحات کی طرف توجہ کی۔ ریاست کے مفاد اور رعایا کی فلاح کو اپنا مآل زندگی بنایا اور مسلسل 25 سال تک اس مقصد اعظم کے حصول میں سعی و محنت کو اپنا اولین فرض تصور کیا اور جو ذرائع و وسائل ممکن ہوئے ان کی بہم رسانی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔

میں اپنے احکم الحاکمین کا شکریہ کرتی ہوں کہ اس نے ہر موقع پر اور ہر تدبیر میں میری اعانت کی اور اس امر کا اندازہ کہ میری کوششیں ریاست بھوپال اور میری رعایا کی بہبودی اور فلاح میں کس قدر کامیاب ہوئیں آپ لوگ خود کر سکتے ہیں۔

حاضرین دربار!

میرے عہد حکومت کے ابتدائی سال نہایت سخت اور صبر آزما تھے لیکن ارحم الراحمین نواب محمد نصر اللہ خاں اور نواب عبید اللہ خاں کو جوار رحمت میں جگہ

دے ان دونوں نے اس سختی اور تردد کو اپنی معاونت اور ہمت و قابلیت سے بڑی حد تک کم کر دیا اور جب تک داعی اجل کو لبیک نہ کہا میرے سرگرم معاون و مددگار رہے۔ میں رعایا کی بھی شکر گزار ہوں کہ وہ ہمیشہ میرے احکام و تدابیر پر بہ خلوصِ دل اور کامل اطاعت مندی کے ساتھ عمل پیرا رہی۔ اور مختلف اوقات میں میری محنتوں اور ان کے نتائج کا قابلِ احترام جذبات کے ساتھ اعتراف کر کے مجھے مطمئن کیا تاہم یہ امکان باقی رہتا ہے کہ حکومت کی اہم ذمہ داریوں میں مجھ سے کوئی ایسی فروگزاشت ہوئی ہو جس سے کسی کے قلب کو کچھ تکلیف پہنچی ہو اس کے لیے میں آج اس موقع پر ان لوگوں سے معافی چاہتی ہوں اور مجھے یقین ہے کہ اس امکان کی صورت میں وہ مجھے معاف کر کے عند اللہ ماجور ہوں گے۔ میں ان تمام سابق و حال اراکینِ دولت کا بھی جنھوں نے اپنے فرائض و خدمات کو دیانت و قابلیت سے انجام دے کر ترقی ملک میں مجھے مدد دی شکر یہ ادا کرنا ان کا حق اور اپنا فرض سمجھتی ہوں۔

اس تمام عہدِ حکومت میں ترقی ملک اور فلاح رعایا کی تدابیر میں مجھے جو مصروفیت رہی وہ خلق اللہ کی ایک خدمت تھی اور اس سے جو اطمینانِ قلبی مجھ کو حاصل ہوتا تھا اس کو میں اپنی محنت کا اجر سمجھتی تھی۔ لیکن گزشتہ 2 سال کے عرصہ میں جو متصل و پیہم صدمات مجھے برداشت کرنے پڑے اگرچہ میں نے ان کو امتحان خداوندی اور مشیتِ الٰہی سمجھ کر انتہائی صبر و سکون سے کام لیا مگر آخر کار جیسا کہ میرے صدمات اور عمر کا تقاضا تھا میرے قلب پر ایک خاص حالت پیدا ہو گئی جس سے مجھے یہ یقین ہو گیا کہ اس کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور مہماتِ امورِ حکومت پر پڑے گا اس لیے میں نے یہی فیصلہ کیا کہ حکومت کے بارِ گراں سے سبکدوشی حاصل کروں اور یہ بارِ امانت اور عنانِ حکومت اپنے وارث اور جانشین کو تفویض کر کے بقیہ حصہ عمر یاد

الٰہی اور بقدر امکان مخلوق خداوندی کے رفاہ اور بالخصوص صنفِ ضعیف کی خدمت میں بسر کروں۔

حاضرینِ دربار! اس ودیعتِ عظمیٰ کا بارِ امانت اب ہز ہائی نس نواب محمد حمید اللہ خاں بہادر سلمہٗ کے قوی بازوؤں پر ہے جن کو میں نے سکندر صولت کے خطاب سے مخاطب کیا ہے تاکہ میری جدۂ محترمہ نواب سکندر بیگم کے نام کی نسبت سے ان کے اعلیٰ ترین اصولِ حکمرانی نواب سکندر صولت کے پیش نظر رہیں۔ وہ اس وقت نہ صرف میری بلکہ تمام رعایائے بھوپال کی امیدوں کا مرکز ہیں اور مجھے یہ اطمینان کلی ہے کہ ان کا دل رعایا کے فلاح و بہبود کے جذبات سے معمور ہے کیونکہ مسلسل 10 سال تک انہی جذبات کے ساتھ انھوں نے میرے رفیق کار کی حیثیت سے نہایت بیدار مغزی اور اعلیٰ قابلیت سے کام کیا ہے جس کی وجہ سے نظم و نسق ملکی اور حکمرانی و رعایا پروری کا پورا تجربہ حاصل ہو گیا ہے مجھے ان کے تحت فرمان ہر طرح سے ملک کا مستقبل درخشاں اور تاباں نظر آتا ہے اور میں بہمہ جہت مطمئن ہوں کہ انشاء اللہ العزیز ان کے عہدِ حکومت میں ملک کی حالت روز بروز بہتر اور ترقی پذیر ہوگی اور رعایائے بھوپال اس فیصلہ پر مجھ کو ہمیشہ دعائے خیر سے یاد کرے گی۔

میں اس مالک الملک کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ اس نے اپنے فضل و کرم سے میرے اس منشا اور فیصلے کے متعلق ہر ایک معاملہ میں میری مدد فرمائی۔

اس موقع پر میرا یہ بھی فرض ہے کہ میں لارڈ ریڈنگ اور ان کی گورنمنٹ کی شکر گزاری کا اظہار کروں کہ انھوں نے سکندر صولت نواب افتخار الملک کے حق وراثت کے متعلق جو کہ شریعتِ اسلام اور رواج ملک پر مبنی تھا میری رائے سے اتفاق کیا۔ میں ہز ایکسلنسی لارڈ ارون وائسرائے ہند کی دلی احسان مند ہوں کہ جب میں نے عنانِ حکومت نواب سکندر صولت

کے ہاتھ میں دے کر اس فیصلے کی نسبت ان سے مراسلت کی تو انھوں نے نہایت لطف و کرم کے ساتھ میری دست کشی پر اظہار تاسف کرتے ہوئے نواب ممدوح الشان کو گورنمنٹ آف انڈیا کی ہمدردی و امداد کلی کا یقین دلایا۔ مجھے یہ فخر ہے کہ ہمیشہ وائسرایانِ ہند اور فرمانروایانِ بھوپال کے تعلقات ایسے شگفتہ رہے ہیں جو ایک مضبوط دوستی اور دائمی ارتباط کے درجہ پر پہنچ گئے ہیں خصوصاً گزشتہ 25 سال میں اس دوستی و ارتباط اور تعلقات میں یوماً فیوماً اضافہ ہی ہوتا رہا ہے۔

حاضرین دربار!

میں یاد دلانا چاہتی ہوں کہ فرمانروایانِ بھوپال اور سلطنتِ برطانیہ کے اتحاد کی مخلصانہ بنیاد 1778 میں قائم ہوئی جس نے 1818 میں ایک قابل احترام معاہدہ کی صورت اختیار کی اور ہمارے اسلاف کرام نے ہمیشہ اس کو بیش از بیش مضبوط و مستحکم کیا۔ اس ڈیڑھ صدی میں اگرچہ بہت سے نازک دور گزرے لیکن فرماں روایانِ بھوپال کی تاج برطانیہ کے ساتھ عقیدت اور وفاداری منبیانِ مرصوص کی طرح ثابت ہوئی۔

نیز فرماں روایانِ بھوپال کے لیے وفاداری کی یہ روایات ایک بیش قیمت اور گراں قدر ترکہ ہیں اور مجھے کامل یقین ہے کہ نواب سکندر صولت اور ان کی اولاد ان روایات کا ہمیشہ احترام کریں گے اور ان کو قائم و دائم رکھیں گے۔ یہ امر مخفی نہیں ہے کہ فرماں روایانِ بھوپال کی وفاداری کا تاجدار سلطنتِ برطانیہ اور ذی مرتبت قائم مقامانِ حکومت نے ہر موقع پر عظیم الشان اعتراف کیا ہے اور ہر امپریل مجسٹی ملکہ وکٹوریہ قیصرۂ ہند کے عہد رافت مہد سے اب تک مسلسل طور پر فرمانرواؤں پر نوازش و الطاف خسروانہ مبذول ہوئے ہیں بالخصوص میں ان عنایات و اکرام شہنشاہی کے شکریہ سے کسی طرح عہدہ برآ نہیں ہوسکتی جو ہر امپریل مجسٹیز ملک

معظم اور ملکۂ معظمہ اور ہز رائل ہائینس پرنس آف ویلز نے ابتدا سے مجھ پر مربی رکھے ہیں اور خصوصاً اس زمانۂ قیام انگلستان میں جو الطاف و عنایات مجھ پر اور میرے خاندان پر فرمائے ہیں ناممکن ہے کہ ان کی شکر گزاری الفاظ میں ادا ہو سکے۔ ان کا نقش ہمارے قلوب پر ہے جو جذباتِ شکر گزاری کے ساتھ ہماری نسلوں کے دلوں پر منعکس ہوتا رہے گا۔ میں لارڈ برکن ہیڈ وزیر ہند کے اخلاق و ہمدردی کو ہمیشہ شکر گزاری کے ساتھ یاد رکھوں گی ان کی ملاقاتوں سے میرے دل میں ڈیوک آف ارگائل کے ان خیالاتِ احترام واعزاز کی یاد تازہ ہوگئی جو ڈیوک ممدوح کے دل میں سرکار خلد نشین اور سرکار خلد مکاں کی نسبت تھے۔

حاضرین دربار!

اب میں آپ سے بحیثیت فرماں روائے بھوپال رخصت ہوتی ہوں اور مجھے اس بات سے بے انتہا مسرت ہے اور میں اس امر پر فخر کرتی ہوں اور رب العالمین کا شکریہ بجالاتی ہوں کہ آج اپنے ہاتھ سے اپنے نورچشم اور عزیز فرزند کو سریرآرائے حکومت کر رہی ہوں۔ میں اس وقت ان کو رعایا و برایائے بھوپال کا محافظ بناتی ہوں اور تمام اخوان وارکانِ دولت اور رعایا کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ ان سب نے اپنی وفاداری اور مطیع الامری سے میرے عہدِ حکومت کو کامیاب بنانے میں ہمہ تن کوشش کی اور میری ہر منشا کی تعمیل کو اپنی زندگی کا ایک اہم فرض سمجھا۔ کوئی حکومت اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک کہ رعایا بھی اپنے فرائض کا احساس کر کے مستعدی وخوش دلی کے ساتھ اپنے حکمراں کے احکام کی تعمیل نہ کرے۔ مجھ کو کامل یقین ہے کہ آپ اس جدید دور میں بھی اپنی روایاتِ سابقہ کے مطابق اس کلیہ کو پیشِ نظر رکھیں گے اور اپنے فرماں روا کے سچے جاں نثار اور فرماں بردار رہیں گے۔

سو سال تک اس ملک کی قسمت صنفِ ضعیف کے ہاتھوں میں رہنے کے بعد اب صنفِ قومی کے ہاتھوں میں سپرد ہوئی ہے جس میں مردانہ اولوالعزمی، بیدار مغزی، بلند حوصلگی، اور شجاعت کے ساتھ فیاضی و رحم دلی اور شفقت و رافت بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ اس لیے یہ یقین کامل ہے کہ ملک اور رعایا کی رفتارِ ترقی میں تیزی پیدا ہو جائے گی اور انشاء اللہ تعالیٰ ملک میں مزید ترقیات کا دور دورہ ہوگا۔ اب میں آخر تقریر میں اس مالک الملک سے جس کے قبضہ قدرت میں سارا عالم ہے اور جس کی ذات کے ساتھ بحیثیت ظل اللہ ہر فرماں روا کو ایک نسبتِ خاص ہے دعا کرتی ہوں کہ نواب سکندر صولت کی عمر و اقبال میں ہمیشہ ترقی ہو۔ ان کی رعایا ان سے خوش رہے، ان کا ملک ہمیشہ سرسبز اور آباد رہے۔ ان کا نام چاردانگِ عالم میں دادگستری اور رعایا پروری کے لیے مشہور ہو اور ان کی ضعیف والدہ کی ان سے جو توقعات ہیں وہ تمام و کمال پوری ہوں۔

نواب سکندر صولت افتخار الملک بہادر! اب میں نہایت مسرت کے ساتھ آپ کو صدر نشین کرتی ہوں اور امید رکھتی ہوں کہ یوں تو آپ انشاء اللہ کلام مجید کے تمام احکام و نصائح پر کاربند ہوں گے لیکن بالخصوص اس آیت شریف کو ہمیشہ اپنے پیشِ نظر رکھیں گے جو میں آپ کو سناتی ہوں اس پر عمل کرنے سے انشاء اللہ تعالیٰ آپ کی دونوں جہاں میں سرخروئی اور سرفرازی ہوگی۔

**اِن اللّٰہ یا مر بالعدل و الاحسان و ایتاء ذی القربیٰ و ینھیٰ عن الفحشاء و المنکر و البغی یعظکم لعلکم تذکرون ط**

## تاثرات

اثنا تقریر میں حضار دربار پر ایک عجیب قسم کا اثر پڑ رہا تھا کبھی خوشی کے آنسو آنکھوں سے نکلتے تھے اور کبھی غم کے۔ کبھی چہرہ پر بشاشت چھا جاتی تھی اور کبھی افسردگی طاری ہو جاتی تھی تقریباً 15 منٹ یہی کشمکشِ

جذبات رہی۔

## مراسمِ دربار

علیا حضرت کی تقریر ختم ہوتے ہی قلعہ فتح گڑھ اور توپ خانہ اپسی سے بیک وقت شلکِ سلامی سر ہوئیں اور فوراً علما کا ایک جلوس آیا۔ یہ تمام علما سفید لباس میں ملبوس تھے اور سفید شالوں کی عبائیں ان کے شانوں پر تھیں۔ قاضی صاحب ریاست کے آگے ایک فوجی افسر کے ہاتھوں میں ایک نشان سفید آفتابی شکل کا تھا جس پر زرنگار طغراے میں اِنَّ الْعِزَّۃَ لِلّٰہِ جَمِیْعًا (یعنی تمام عزتیں اللہ ہی کے لیے ہیں) تحریر تھا جس کو قاضی ریاست نے ہز ہائینس کے سامنے پیش کیا اور انھوں نے اپنے دست مبارک میں لے کر نشان بردار کو سپرد فرمایا اور یہ نشان مذکورہ الصدر نشانوں کے بیچ میں کھڑا کیا گیا۔ پھر شاہی خلعت کی کشتیاں سامنے آئیں علیا حضرت سرکار عالیہ نے ہز ہائی نس کے فرقِ مبارک پر سرپیچ وکلغی لگائی اور قاضی ریاست نے اس کی بندش کی پھر ہار مروارید اور انگشتری الماس پہنائی گئی اور اراکین مجلس علما و مشیر الہام افواج ریاست نے پستول، تلوار، پیش قبض، چھری، گرز، کمان، ترکش، زرہ، بکتر آہنی اور آہنی دستانے پیش کیے، قلمدان حکومت اور مہر ریاست پریسیڈنٹ کابینۂ عالیہ نے شاہی مہر علیا حضرت کے پرائیویٹ سکریٹری نے خزانہ و توشک خانہ کی طلائی و نقرئی کنجیاں جو خاص انھیں مواقع کے واسطے ہوتی ہیں، خزانچی ریاست نے پیش کیں۔ دینار سرخ کی 31 تھیلیاں پیش کی گئیں جو اعلیٰ حضرت کے قدموں کے نزدیک کشتی میں رکھ دی گئیں اور علیا حضرت نے ایک تھیلی اٹھا کر اپنے لختِ جگر کے سر پر نچھاور (یعنی تصدق) کر کے دوسری کشتی میں رکھی۔ نچھاور کی یہ تھیلی بعد میں فقرا کو تقسیم کی گئی۔ ان مراسم کے ادا

ہونے کے بعد قاری صاحب جو تخت شاہی کے قریب ہی کرسی پر بیٹھے تھے کھڑے ہوئے اور انھوں نے سورہ 2 لقمان کا دوسرا رکوع اور سورہ 3 الم نشرح کی تلاوت کی اور تمام حاضرین بطریق اول تعظیم کے لیے استادہ ہو گئے۔ ختم تلاوت کے بعد ہز ہائی نس نے ایک نہایت پُر اثر تقریر فرمائی جس میں اس عظیم ذمہ داری کے احساس، علیا حضرت کے احسانات تربیت وشفقتِ مادری کا شکریہ واعتراف، نصائح پر عمل پیرائی کا وعدہ تھا اور ملک ورعایا کے جذبات بہبودی وفلاح سے معمور ایک خاص قسم کے اثر میں ڈوبی ہوئی تھی جس سے ہر قلب متاثر تھا۔

## نصائح خاص

عالی حضرت کی تقریر کے بعد پھر سرکار عالیہ کھڑی ہوئیں اور اعلیٰ حضرت کو مخاطب کر کے پہلے بطور نصائح آیات ذیل تلاوت کیں۔

(1) إن اللّٰه يامر بالعدل و الاحسان و ايتاء ذى القربىٰ و ينهىٰ عن الفحشاء و المنكر و البغى ط 4

(2) وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَ السَّآئِلِيْنَ وَ فِى الرِّقَابِ ج اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ ج وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عَاهَدُوْا ج 5

(3) وَ اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا 6

اور پھر اپنے دستِ شفقت میں ہز ہائی نس کا ید رشد وسعادت لے کر درمیانی کرسی پر جو تختِ شاہی کی کرسی تھی بٹھایا اور ہز ہائی نس کے رخسارۂ مبارک کا بوسہ لیتے ہوئے کہا کہ

رَبِّ اوزعنى ان اشكر نعمتك الَّتِى اَنْعَمْتَ عَلَىَّ وَعَلٰى وَالِدَىَّ اَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا ترضٰهُ وَاَصْلِحْ لِىْ فِىْ ذُرِّيَّتِىْ ط

اِنِّی تُبْتُ اِلَیْکَ وَاِنِّی مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ 7

نذریں اوراختتام دربار

اس پُرعظمت اور پُر جلال رقت انگیز نصیحت آموز نظارہ کے بعد نواب گوہر تاج بیگم پرنسس عابدہ سلطان نہایت متانت کے ساتھ اُٹھ کر تخت شاہی کے سامنے آئیں اور ہز ہائی نس کے سامنے نذر پیش کی، زاں بعد دیگر ملکی و فوجی افسروں کی نذریں پیش ہوئیں مگر بہ نظرِ احترام علما اور سادات نذر سے مستثنٰی تھے۔ نذروں کے بعد عطر، پان، ہار پھول وغیرہ تقسیم ہوئے اور دربار ختم کیا گیا جس ترتیب اور جلوس کے ساتھ داخلہ ہوا تھا اسی طرح دربار ہال سے روانگی ہوئی۔

یہ کل مراسم تقریباً دو گھنٹہ میں انجام پذیر ہوئے اور اس دربار کے ساتھ ہی سرکار عالیہ کا دورِ حکومت بھی ختم ہو گیا۔

---

1 1907 میں ''دفتر تاریخ'' کے مہتمم مقرر ہوئے۔ یہ نواب سلطان جہاں بیگم کی تصنیف و تالیف کے اہتمام کا دفتر تھا مگر اس میں ملکی، قومی، صنعتی و حرفی معاملات سے متعلق بعض مہمات امور کا بھی مواد جمع رہتا تھا جس کے نگراں محمد امین زبیری صاحب تھے۔

2 اس رکوع میں وہ نصائح ہیں جو حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو شرک سے بچنے اور ماں کی اطاعت، نماز کی پابندی اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے احکام اور مصیبت پر صبر، نخوت سے احتراز، میانہ روی اور نرمی وغیرہ کی بابت کی ہیں۔

3 رفعتِ مرتبہ اور مصیبت کے بعد راحت اور خدا کی طرف رجوع ہونے کی ہدایت ہے۔

4 ترجمہ: (مسلمانو) اللہ انصاف کرنے کا حکم دیتا ہے اور (لوگوں کے ساتھ) احسان کرنے کا اور قرابت والوں کو (مالی امداد) دینے کا اور بے حیائی (کے کاموں) اور ناشائستہ حرکتوں اور (ایک دوسرے پر) زیادتی کرنے سے منع فرماتا ہے۔

5 ترجمہ: اور مال (عزیز) اللہ کی محبت پر رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں اور مانگنے والوں کو دیا اور غلامی وغیرہ کی قید سے لوگوں کی گردنیں چھڑانے میں دیا اور نماز پڑھتے اور زکوٰۃ دیتے رہو اور جب کسی بات کا اقرار کرلیا تو اپنے قول کے پورے رہے۔

6 ترجمہ: اور عہد کو پورا کیا کرو کیونکہ (قیامت کے دن) عہد کی باز پرس ہوگی۔

7 ترجمہ: اے میرے پروردگار مجھے اس (بات) کی توفیق دے کہ تو نے جو مجھ پر اور میرے ماں باپ پر احسانات کیے ہیں تیرے ان احسانات کا شکریہ ادا کرتا رہوں اور اس (بات) کی (بھی توفیق دے) کہ میں ایسے نیک عمل کروں جن سے تو راضی ہو اور میری اولاد میں نیک بختی پیدا کر (کہ میرے لیے موجب راحت ہو) میں (اپنی تمام حاجتوں میں) تیری طرف رجوع لاتا ہوں اور میں تیرے فرماں بردار بندوں میں ہوں۔

# کتابیات


1۔ آپ بیتی (ایم اے او کالج کی کہانی) — میر ولایت حسین — علی گڑھ، 1970

2۔ آئینِ سکندری — نواب سکندر جہاں بیگم — حمیدیہ آرٹ پریس، بھوپال

3۔ افتخار الملک (تذکرہ نواب حبیب اللہ خاں) — محمد امین زبیری مارہروی — بھوپال، 1946

4۔ اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ — ڈاکٹر سلیم حامد رضوی — بھوپال پریس۔ 1965

5۔ اوراقِ گل — جلیل قدوائی — کراچی، 1989

6۔ ایک باغی شہزادے کی خودنوشت — عابدہ سلطان — اوکسفورڈ یونیورسٹی، کراچی (پاکستان) 2007

7۔ برکاتِ سلطانی — پیارے لال شاکر — نول کشور لکھنؤ، 1915

8۔ بیگماتِ بھوپال — محمد امین زبیری مارہروی — مطبع سلطانی، بھوپال، 1918

| | | |
|---|---|---|
| 9۔ بیگماتِ بھوپال | مرتبہ حسن چشتی | قدسیہ پرنٹرس، کراچی 1981 |
| 10۔ تاریخ فرماں روایانِ بھوپال | جلیل قدوائی | بھوپال پریس، 1977 |
| 11۔ تاریخ الہ بھوپال | سید مہدی علی سہسوانی | مطبع عالی جاہ، گوالیار، 1913 |
| 12۔ تاریخ ریاستِ بھوپال | عابد علی وجدی الحسینی | بھوپال بک ہاؤس، 1994 |
| 13۔ توقیعات واوامر نواب سلطان جہاں بیگم | تدوین منشی واجد علی خاں | مطبع گورنمنٹ بھوپال، 1921 |
| 14۔ حیاتِ سلطانی | محمد امین زبیری مارہروی | عزیزی پریس آگرہ، 1939 |
| 15۔ حیاتِ آفتاب | ڈپٹی حبیب اللہ | اسرار کریمی پریس، الہ آباد، (ولایت منزل علی گڑھ) 1947 |
| 16۔ حیاتِ حسن | محمد امین زبیری مارہروی | ریاستِ بھوپال، 1933 |
| 17۔ خطباتِ سلطانی | نواب محمد حمید اللہ خاں | مطبع سلطانی، بھوپال |
| 18۔ ذکرِ علی گڑھ | الحاج محمد زبیر | کراچی، پاکستان |
| 19۔ ریاستِ بھوپال اور مشاہیر اردو | ڈاکٹر ارجمند بانو افشاں | نئی دہلی، 2012 |
| 20۔ سرسید کے فکری زاویے | ڈاکٹر نفیس بانو | الہ آباد، 2005 |
| 21۔ سرسید اور بھوپال | ڈاکٹر محمد نعمان خاں | نئی دہلی |
| 22۔ سلسلۂ سلطانیہ | مؤلفہ منشی انوار الحق | مطبع سلطانی، ریاستِ بھوپال |
| 23۔ سلطان جہاں بیگم (تعارف) | مرتبہ ڈاکٹر سیما صغیر | ایف ای اے، علی گڑھ 2013 |
| 24۔ سوانح عمری شیخ محمد عبداللہ | شمس الرحمٰن محسنی | ایف ای اے، علی گڑھ |
| 25۔ ضیائے حیات | محمد امین زبیری مارہروی | محمدی پریس، کراچی پاکستان |

| | | |
|---|---|---|
| 26۔ عصرِ جدید بھوپال | مرتبہ محمد امین زبیری | بھوپال، 1929 |
| 27۔ علی گڑھ اور بھوپال | پروفیسر حکیم سید ظل الرحمٰن | مشمولہ میر اچمن مرتبہ ڈاکٹر رضیہ حامد، بھوپال |
| 28۔ مسلم یونیورسٹی کی کہانی | پروفیسر افتخار عالم خاں | زہرہ باغ علی گڑھ ۔2002 |
| 29۔ علی گڑھ میرا چمن | مرتبہ ڈاکٹر رضیہ حامد | بھوپال، 2001 |
| 30۔ مسلم گرلس کالج کے مختصر تاریخی حالات | شیخ محمد عبداللہ (مرتبہ، مہر الٰہی ندیم) | فیمیل ایجوکیشن ایسوسی ایشن، علی گڑھ 2004 |
| 31۔ مشاہدات وتاثرات | شیخ محمد عبداللہ | ایضاً 1969 |
| 32۔ نواب سلطان جہاں بیگم | ڈاکٹر رضیہ حامد | بھوپال، 2011 |
| 33۔ نواب سلطان جہاں بیگم: حیات وخدمات | مرتبہ: اطہر صدیقی | فیمیل ایجوکیشن ایسوسی ایشن، علی گڑھ، 1913 |
| 34۔ نواب صدیق حسن خاں | ڈاکٹر رضیہ حامد | دہلی، 1998 |
| 35۔ وسط ہند میں اردو ادب | ڈاکٹر مہتاب عالم | بھوپال، 2010 |
| 36۔ ہندوستان اسلام کے سائے میں | سید مہدی علی وجدی | مطبع سلطانی، ریاستِ بھوپال |
| 37۔ ہندوستانی مسلم خواتین کی علمی خدمات (عہدِ سلطنت تا 1947) | ڈاکٹر ناہید ظفر | ایم آر پبلیکیشنز، نئی دہلی، 2011 |
| 38۔ یادِ ایام | نواب احمد سعید خاں | علی گڑھ |

## اخبار ورسائل

| | | |
|---|---|---|
| 1۔ روزنامہ ندیم بھوپال | ایڈیٹر اشتیاق عارف | 1949-50 |

| | | |
|---|---|---|
| 2۔ ایضاً افکار ایضاً | ایضاً | 1952-58 |
| 3۔ ایضاً آفتاب ایضاً | ایضاً | 1975-77 |
| 4۔ ہفت روزہ ایاز بھوپال | مدیر اشفاق مشہدی ندوی | 1992 |
| 5۔ پندرہ روزہ شعلۂ حیات بھوپال | مدیر ایم عرفان | 1965 |
| 6۔ ماہنامہ کتاب نما، نئی دہلی | مدیر شاہد علی خاں | 1995 |
| 7۔ ماہنامہ رسالہ خاتون علی گڑھ | مدیر شیخ محمد عبداللہ | 1904 تا حال |
| 8۔ ایضاً کے اداریے | مرتبہ ڈاکٹر ناز بیگم | 2001 |
| 9۔ سہ ماہی فکر و آگہی بھوپال نمبر | مرتبہ ڈاکٹر رضیہ حامد | 2001 |
| 10۔ ایضاً علی گڑھ نمبر | ایضاً | ایضاً |
| 11۔ سہ ماہی فکر و نظر، علی گڑھ دوسرا کارواں | مدیر شہریار | 1985 |
| 12۔ ایضاً ایضاً فارسی ادب نمبر | مدیر آزرمی دخت صفوی | 2011 |

## انگریزی کتب ورسائل

1. An Account of my life, Nawab sultan Jahan Begum, Translated by C.H.Payne, London, John Murray, 1910. Vol. I,
2. An Account of my life, Translated by Major Abdus Saeed Khan, The Times press, Bombay, Vol. II&III, 1992.
3. Begum Of Bhopal, By Claudia Prackel, Published Pioneer jPress Allahabad 1912, Roli Books, 2002,
4. Woman to woman: Speechers on female education and kindred, subjects by H.H.The Nawab Sultan Jahan

بیگم سلطان جہاں بے حد حساس خاتون تھیں۔ انھوں نے اپنی قوتِ ارادی، تعمیری سوچ، شعرفہمی اور علم دوستی کی بدولت ریاستِ بھوپال کو تاریخ کے اوراق میں زندہ اور تابندہ کر دیا ہے۔ ان کی زندگی سے یہ پیغام ملتا ہے کہ عورت زندگی کے ہر میدان میں آگے آ کر نئی دنیا کی تعمیر میں اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔ بیگم سلطان جہاں 9/ جولائی 1858 میں پیدا ہوئیں۔ 1902 میں ریاستِ بھوپال کی حکمراں بنیں۔ 1920 میں ایم۔ اے۔ او۔ کالج کو یونیورسٹی کا درجہ ملا تو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی پہلی چانسلر مقرر ہوئیں۔ طبقۂ نسواں کی تعلیم و تربیت کے لیے ان کی کوششوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ تصنیف و تالیف سے انھیں بے پناہ رغبت تھی۔ 72 برس کی عمر میں، 12/ مئی 1930 کو وہ اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملیں۔

اس مونوگراف کی مصنفہ ڈاکٹر سیما صغیر نے باندہ (اتر پردیش) کے ایک زمیندار گھرانے میں آنکھ کھولی۔ والد سید عبید الرحمٰن حسنی (مرحوم) عالمِ دین اور مقرر تھے۔ سیما صغیر نے کانپور یونیورسٹی سے بی۔ اے۔ اور بی۔ ایڈ۔ کرنے کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم۔ اے۔ اور پی ایچ۔ ڈی۔ کی ڈگری حاصل کی۔ 1990 میں ان کی ڈاکٹر صغیر افراہیم سے شادی ہوئی۔ شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں درس و تدریس سے افرائض انجام دے رہی ہیں۔ ان کی دلچسپی کا خاص میدان فکشن ہے۔ نسائی ادب، تنقید اور تحقیق پر 6 کتابیں اور 50 مضامین شائع ہو چکے ہیں۔


قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
فروغ اردو بھون، ایف سی، 33/9،
انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولا، نئی دہلی۔ 110025

ISBN 978-93-5160-107-4

NCPUL
New Delhi

₹ 83.00